محسن بھوپالی: ایک مطالعہ
عرشی سلطان

محسن بھوپالی: ایک مطالعہ

عرشی سلطان

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

"یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔
شائع شدہ مواد سے اردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔"

MOHSIN BHOPALI - Ek MUTALA'AH

by: Arshi Sultan

Year of Publication - Feb. 2019
ISBN 978-93-88736-72-5

₹ 145/-

نام کتاب	:	محسن بھوپالی۔ایک مطالعہ
مصنفہ و ناشر	:	عرشی سلطان
سنِ اشاعت	:	فروری ۲۰۱۹ء
کمپوزنگ	:	محمد شاکر ندوی
موبائل نمبر	:	8817933655
صفحات	:	۲۳۲
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۱۴۵ روپے
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶
رابطہ/پتہ	:	عرشی سلطان
	:	مکان نمبر ۲۳، گلی نمبر ۲، نزد مسجد باجوریان، منگلوارہ روڈ، چھاؤنی

بھوپال۔462001 (ایم پی) موبائل:8817933655

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, 45678286, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب!

اپنے والدین اور اساتذہ کرام کے نام

کہ جن کی محنتوں اور شفقتوں کی وجہ سے میں

اس قابل ہوئی!

عرشی سلطان

محسن بھوپالی: ایک مطالعہ

ترتیب ابواب

اپنی بات

شعر و ادب سے دلچسپی مجھے بچپن سے ہی رہی، بھوپال جسے کہ شہرِ غزل سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، میرا وطنِ عزیز ہے۔ بھوپال کی ادبی قدامت مسلم ہے۔ ابتدا ہی سے شعر و شاعری کا رواج عام رہا ہے۔ از ابتداء تو حال بھوپال نے کئی ایسے اہم شعراء کو جنم دیا ہے۔ جن کی شہرت اور مقبولیت ملک گیر ہی نہیں بلکہ عالمگیر رہی ہے۔ ایسے ہی مقبول اور مشہور شعراء میں ایک نام عبدالرحمٰن محسنؔ بھوپالی کا بھی ہے۔ محسنؔ بھوپالی بنیادی طور پر فطری شاعر تھے۔ اگر چہ ان کا اصل ادبی میدان شاعری ہی تھا لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے سبب ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اس لیے انھوں نے شعر گوئی کے ساتھ ساتھ بعض نثری اصناف میں بھی اپنی ادبی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ محسنؔ بھوپالی کی شعر گوئی کا آغاز صغرسنی میں ہی ہو گیا تھا۔ نظم گوئی سے انھیں فطری مناسبت تھی لہٰذا انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز نظم نگاری سے کیا اور ابتداء سے ہی اپنی ایک علاحدہ پہچان قائم کرنے میں کامیاب ہوئے، موضوعات کی وسعت کے سبب بھی انھوں نے نظم گوئی کی جانب نہ صرف توجہ دی بلکہ غزل کے مقابلے نظمیں زیادہ تعداد میں لکھی ہیں۔

انھوں نے مختلف موضوعات پر نہ صرف کئی مختصر و طویل نظمیں کہیں بلکہ مغربی ادب سے متاثر ہو کر اس صنفِ سخن میں بھی بعض تجربے بھی کیے۔ انھوں نے جہاں جاپانی صنف ''ہائیکو'' میں طبع آزمائی کی، وہیں بعض شعری تراجم بھی کیے اور ایک نئی صنف ''نظمانے'' ایجاد کر کے اردو ادب کے سرمائے میں اضافہ کیا۔ اردو میں شاعر تو بہت ہیں لیکن ایسے شعراء کم ہی ہیں جن کے اشعار دبی زبان زدِ خاص و عام ہو کر ضرب المثل بن کر شہرتِ دوام حاصل کر چکے ہوں۔ محسنؔ بھوپالی کے کئی اشعار ایسے ہیں جو نہ صرف عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول ہی بلکہ ضرب المثل کی حیثیت بھی اختیار کر چکے ہیں، ان کا یہ شعر۔

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل اُنھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

('شکستِ شب' 1961ء)

ہماری جان پر دُہرا عذاب ہے محسنؔ
کہ دیکھنا ہی نہیں ہم کو سوچنا بھی ہے

('ماجرا' 1981ء)

تمھیں آسائشِ منزل مبارک
ہمیں گردِ مسافت ہی بہت ہے

('گردِ مسافت' 1988ء)

یہ محض ایک شعر نہیں ہے بلکہ برصغیر میں ماضی کے مخصوص سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور ان حالات پر بھرپور طنز بھی کیا گیا ہے۔ محسنؔ بھوپالی کے کلام میں ایسی مثالیں کئی جگہ مل جاتی ہیں مثلاً

راہبر بنے ہیں سب راہزن نہیں کوئی
پھر بھی کارواں محسنؔ کیوں شکارِ گردش ہے

☆

زیست ہمسائے سے مانگا ہوا زیور تو نہیں
ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کھو جانے کا

☆

تلقینِ اعتماد وہ فرما رہے ہیں آج
راہِ طلب میں خود جو کبھی معتبر نہ تھے

☆

جاہل کو اگر جہل کا انعام دیا جائے
اس حادثۂ وقت کو کیا نام دیا جائے

☆

میخانے کی توہین ہے، رندوں کی ہتک ہے
کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

محسن بھوپالی کا کلام صرف اپنی رنگ وطرز کا حامل نہیں ہے بلکہ انھوں نے زندگی اور سماج سے متعلق دیگر معلومات و مسائل پر اثر انداز لیکن اظہارِ خیال کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

محسن بھوپالی کی غزل گوئی نے ہی مجھے متاثر نہیں کیا بلکہ ان کی نظم گوئی نے بھی خاصا متاثر کیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ محسن بھوپالی بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ موضوعات کی وسعت اور تنوع کے لحاظ سے کیونکہ غزل کا دامن تنگ اور محدود سمجھا جاتا ہے اس لیے دیگر نظم گو شعراء کی طرح محسن بھوپالی نے بھی نظم گوئی کی جانب زیادہ توجہ دی ہے۔ ابتداء میں اگر چہ انھوں نے بچوں کے لیے کئی نظمیں لکھیں لیکن جلد ہی وہ سنجیدہ موضوعات کی جانب متوجہ ہو گئے اور کئی اہم اور متاثر کن نظمیں انھوں نے تخلیق کی ہیں۔ ان کی نئی نظمیں ہماری سیاسی، سماجی اور قومی تاریخ کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ حب الوطنی، سیاسی، سماجی، انفرادی اور اجتماعی مسائل پر لکھی گئیں ان کی نظموں میں موضوع اور فن دونوں کا حق ادا کیا گیا ہے۔

شعروشاعری سے مجھے خاصا لگاؤ رہا ہے اور ہر اچھا اور بڑا شاعر مجھے متاثر کرتا رہا ہے۔ محسن بھوپالی کے کلام کا جب میں نے مطالعہ کیا تو میں اس سے خاصی متاثر ہوئی اور جیسے جیسے مطالعہ میں اضافہ ہوتا گیا، ان کی طرف میرا رجحان بڑھتا گیا اور وہ میرے پسندیدہ شاعر بن گئے۔ تو میں نے نہ صرف ان کے تمام شعری مجموعوں کا مطالعہ کیا بلکہ ان کی شعری اور ادبی خدمات پر باقاعدہ طور پر کام کرنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی۔ زیرِ نظر کتاب دراصل میری اسی دلی خواہش کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب کی تکمیل میں ڈاکٹر پروفیسر محمد نعمان خاں صاحب اور اقبال مسعود صاحب اور پروفیسر مختار شمیم صاحب، محترمہ طاہرہ عباسی اور میرے شوہر محمد جاوید انصاری صاحب کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو میں آج اِس مقام پر نہ ہوتی۔ ان کی محنتیں اور رفاقتیں

میری زندگی کا حاصل ہیں۔ اور والد محمد عتیق انصاری صاحب اور والدہ ریحانہ سلطان صاحبہ کی ممنون ہوں کہ جنھوں نے اس کتاب کی تیاری کرتے وقت گھر کی ذمہ داریوں سے آزاد رکھا اور پورا تعاون دیا۔ برادران محمد عارف انصاری، محمد انصار انصاری، محمد عابد انصاری اور بہنیں رضیہ سلطان اور صفیہ سلطان اور عائشہ انصاری، ان سبھی کے لیے میں تہہ دل سے سپاس گزار ہوں۔

بھوپال　　　　　　　　　　　　عرشی سلطان

☆☆☆

محسن بھوپالی: حیات، سیرت اور عہد

محسن بھوپالی کے اسلاف، ولادت، بچپن، ابتدائی، ثانوی تعلیم، ترک وطن، مزید تعلیم، انجینئرنگ میں ڈپلومہ، اردو میں ایم.اے. ملازمت اور وظیفہٗ حسن خدمات، شادی، اولادیں، شعر گوئی کا آغاز، رشتہٗ تلمذ، ادبی اور شعری سرگرمیاں، رسالوں میں کلام کی اشاعت کتب اور صحافت و اداکاری۔ غیر ممالک کے اسفار، ادبی کانفرنسوں اور مشاعروں میں شرکت (ملکی و عالمی) محسن بھوپالی کا شعری و ادبی سرمایہ۔ احتجاجی شاعری۔ اعترافِ خدمات، اعزازات و انعامات۔ تحقیقی مقالے۔ طویل علالت، انتقال۔ خراجِ عقیدت۔

محسن بھوپالی کے اسلاف:

محسن بھوپالی کے آبا و اجداد کا تعلق مدینہ، سعودی عرب سے تھا، ان کے دادا بشیر احمد کی روایت کے مطابق ان کے مورث اعلیٰ شیخ بدرالدین، عباسی دور خلافت میں مدینے سے ایک تجارتی قافلے کے ہمراہ سندھ ہجرت کر کے پہنچے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس بات کی تصدیق نزہت انیس بھی کرتی ہیں اس سلسلے میں وہ اپنے مقالے میں لکھتی ہیں۔

''آپ کے دادا بشیر احمد مرحوم کی روایت کے مطابق ان کے مورث اعلیٰ شیخ بدرالدین مدینے سے عباسی دورِ خلافت میں سندھ تجارتی قافلے کے ساتھ آئے اور پھر وہیں سکونت اختیار کی۔'' [۱]

نزہت انیس نے ''محسن بھوپالی شخصیت وفن'' کے عنوان کے تحت ۱۹۹۹ء میں ایم اے کا مقالہ تحریر کیا تھا۔ جو ۲۰۰۲ء میں اسی نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس وقت محسن بھوپالی حیات تھے اور تمام معلومات محسن بھوپالی سے براہ راست حاصل کی گئی تھیں۔ یہ کتاب بھی ۲۰۰۲ء میں یعنی محسن بھوپالی کی حیات میں ہی شائع ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کی مشمولات عام طور پر معتبر ہیں اور جب تک کسی دوسرے شواہد سے ان کے غلط ہونے کی تصدیق نہ ہو جائے تب تک ان معلومات کو مستند ہی مانا جائے گا۔

شیخ بدرالدین کے بیٹے شیخ چاند بعد میں وسط ہند کی ایک ریاست کے راجہ ہوشنگ شاہ کے ایک فوجی دستے کے سالار ہو گئے۔ راجہ ہوشنگ شاہ نے ہی بھوپال سے تقریباً پچھتر کلومیٹر دور نرمدا ندی کے کنارے پر واقع شہر ہوشنگ آباد کو آباد کیا تھا۔ ہوشنگ شاہ نے شیخ چاند کو ایک بار ایک مہم پر یہ کہہ کر روانہ کیا کہ اگر مہم میں کامیاب ہو گئے تو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا اور اگر مہم سے ناکام ہو کر لوٹے تو زمین میں زندہ گاڑ دیا جائے گا۔ شیخ چاند اپنے ساتھیوں کے ساتھ جی جان سے لڑے اور فتح حاصل کی۔ جب گھر واپس لوٹے تو انھیں بہت انعام و اعزاز سے نوازا گیا لیکن سب

سے بڑی خوش خبری انھیں صاحب اولاد ہونے کی ملی۔ اس اولاد کا انھوں نے فتح محمد نام رکھا۔ فتح محمد کا بچپن سے ہی مذہب کی طرف رجحان غالب رہا انھوں نے تمام عمر مذہب اور انسانیت کے فروغ میں لگا دی وہ تلاش حق اور تصوف میں اپنا بیشتر وقت لگاتے۔ ان کی مزار اٹارسی، (ضلع ہوشنگ آباد) کے نزدیک ایک گاؤں کیسلا میں ہے اس مزار پر ہر سال عرس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں تھوڑا اختلاف ہے نزہت انیس نے محسن بھوپالی کے چچا عبدالخالق کے بیان کے مطابق اس کی وضاحت کی ہے، وہ لکھتی ہیں۔

> ''آپ کے منجھلے چچا عبدالخالق صاحب کے بیان کے مطابق آپ کے پر دادا کے مسلک کے خلاف مزار میں تبدیل ہو گئی اور خود ساختہ متولی ہر سال عرس کا اہتمام کرتے ہیں۔''۲

بعض اوقات لوگ لالچ میں آ کر بھی قبر پر عرس وغیرہ کا اہتمام کرنے لگتے ہیں اور خود متولی بن جاتے ہیں۔ کیونکہ مزاروں سے جہاں بڑی سطح پر عرس ہونے لگتے ہیں عقیدت مند وہاں بڑی تعداد میں پیسے بھی دینے لگتے ہیں۔ بہر حال سچائی جو بھی ہو لیکن اتنا یقینی ہے کہ فتح محمد ایک بزرگ ہستی تھے۔ فتح محمد کے فرزند شیخ محمد تھے انھوں نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اور بھوپال کی عدالت میں سررشتہ دار کے عہدے پر فائض ہوئے۔ شیخ محمد کے صابزادے بشیر احمد زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے لیکن انھیں مطالعہ کا بے حد شوق تھا ان کے کتب خانے میں اس عہد کے مطابق بیشتر کتابیں موجود تھیں جن میں دینی اور ادبی دونوں طرح کی کتابیں شامل تھیں۔

بشیر احمد کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ محسن بھوپالی کے والد حاجی عبدالرزاق اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے بھائیوں کے نام عبدالرحیم، عبدالرشید اور عبدالرفیق تھا اور بہنوں کے نام قریشہ خانم، کلثوم عتیق، نفیسہ پیرزادہ اور نعیمہ کشور تھے۔ عبدالرزاق محکمۂ ڈاک وتار میں مختلف عہدوں پر ملازمت کی

اوران کا تبادلہ بھوپال اوراس کے آس پاس کے مختلف شہروں میں ہوتا رہتا تھا۔

ولادت:

محسن بھوپالی کی پیدائش کے سلسلے میں نزہت انیس فرماتی ہیں۔

''آپ کا نام عبدالرحمٰن ہے۔۲۹ ستمبر،۱۹۳۲ء کو بھوپال سے متصل ضلع ہوشنگ آباد کے قصبہ سہاگ پور میں پیدا ہوئے۔''[۳]

محسن بھوپالی نے اپنے شعری مجموعے 'منزل' کے آخر میں سوانحی کوائف درج کیے ہیں اس سے بھی پیدائش ان کی پیدائش کی تصدیق ہوتی ہے۔سوانحی کفائف میں چند بنیادی باتیں حسب ذیل ہیں۔

''سوانحی کوائف

نام :عبدالرحمٰن

والد :حاجی محمد عبدالرزاق (رٹائرڈ ڈپٹی پوسٹ ماسٹر، ہیڈ پوسٹ آفس لاڑکانہ،سندھ)

تخلص :محسن بھوپالی

قلمی نام :ابوراشد

آبائی وطن : بھوپال (سینٹرل انڈیا)

پیدائش :۲۹ ستمبر،۱۹۳۲ء بھوپال سے متصل ضلع ہوشنگ آباد کا قصبہ سہاگ پور۔''[۴]

اسی طرح کئی دیگر مستند ذرائع مثلاً رسالہ سپوتنک کا محسن بھوپالی نمبر (اکتوبر ۲۰۰۰ء) سے بھی ان کی پیدائش کی تصدیق ہوتی ہے اس سلسلے میں کہیں کوئی اختلاف نظر نہیں آتا ہے۔اس طرح محسن بھوپالی کی پیدائش یقینی طور پر ۲۹ ستمبر،۱۹۳۲ء کو ہوئی۔ اوران کی جائے پیدائش ہوشنگ آباد ضلع کے قصبہ سہاگ پور میں ہوئی تھی۔

بچپن:

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ محسن بھوپالی کے والد عبدالرزاق محکمۂ ڈاک وتار میں ملازم تھے اور مختلف شہروں اور قصبوں میں ان کی تقرری ہوتی رہتی تھی جس سے وہ ان شہروں میں قیام پذیر رہتے تھے لیکن محسن بھوپالی کا بیشتر بچپن بھوپال ہی میں گزرا اوران کی ابتدائی تعلیم بھی بھوپال ہی میں ہوئی۔ چونکہ محسن بھوپالی ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کر گئے تھے، اس لیے وہ محض ۱۵ برس ہندستان میں رہے جس میں سے ان کا بیشتر وقت بھوپال میں گزرا لیکن اس دوران انھیں کئی اور شہروں کو بھی دیکھنے کا موقع ملا، اس سلسلے میں نزہت انیس لکھتی ہیں۔

> ''رشتہ داروں اور اعزاء کے ہاں آمد و رفت کے سلسلے میں مدھیہ پردیش کے شہر ہوشنگ آباد، اٹارسی، بھساول اور ناگپور کے علاوہ یو پی کا شہر کانپور بھی دیکھا۔ ابتدائی تعلیم حبیبیہ مڈل اسکول اور الیگزنڈرا ہائی اسکول بھوپال سے حاصل کی۔''۵

یہاں وضاحت طلب امر یہ ہے کہ اب ہوشنگ آباد اور اٹارسی مدھیہ پردیش میں، بھساول اور ناگپور شہر مہاراشٹر میں اور کانپور یو پی میں ہیں۔ ان پندرہ برسوں کے بارے میں بہت زیادہ معلومات تو نہیں ملتی ہے لیکن دو واقعات کا ذکر محسن بھوپالی نے خود گلزیب زیبا کو دیے گئے انٹرویو میں کیا ہے۔ یہ انٹرویو انھوں نے کراچی سے نکلنے والے ہفت روزہ 'معیار' کے لیے لیا تھا۔ پہلا سوال یہ تھا۔

> ''س: بچپن کے دلچسپ واقعات جنھیں یاد کر کے آج بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی ہو۔
>
> ج: بے شمار دلچسپ واقعات ہیں مگر ایک دو تو بھلائے نہیں جا سکتے، اب تک یاد آتے ہیں تو بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ گرمیوں کا زمانہ تھا اور میری عمر بھی کوئی ۱۳ سال تھی اور چھٹی

جماعت میں پڑھتا تھا ایک دوپہر کو اپنے ہم جماعت ولی محمد کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ قلفی بیچنے والا گلی میں آیا میں نے اور ولی محمد نے فوراً ایک پروگرام بنایا اور اس آدمی کو قریب بلایا۔ زینے کے دروازے کے پیچھے سے نسوانی آواز نکال کر چکھنے کے لیے تھوڑی سی برف ملائی مانگی۔ اس بیچارے نے میرے ذریعے سے تھوڑی سی اندر بھجوائی۔ اندر لا کر ہم دونوں نے فوراً کھالی اور پھر نسوانی آواز بنا کر اسے کہا کہ "اچھی ہے دو آنے کی دے دو۔" اس بے چارے نے دو آنے کی بہت ساری برف ملائی ہمیں دے دی اور ہم نے چھت پر جا کر خوب مزے لے کر کھالی اور پھر چپ کے سے دوسرے جانب کے زینے سے اتر کر چلے گئے اور بیچارے برف ملائی والے نے خدا جانے کب تک پیسوں کا انتظار کیا ہوگا۔"[۶]

اسی انٹرویو میں ایک دوسرا سوال ہے۔

"س: بچپن کی مخصوص عادات جو چھٹ گئیں یا وہ موجود ہیں۔

ج: امرتی کھانے کی عادت بچپن میں زوروں پر تھی۔ اب بھی اور اللہ کا شکر ہے کہ شوگر سے محفوظ ہوں۔"[۷]

اس کے بعد اگلا سوال کچھ اس طرح ہے۔

"س: تحریک پاکستان میں تو شاید آپ نے حصہ نہ لیا ہو کیونکہ اس وقت آپ نہایت کمسن رہے ہوں گے۔ لیکن آپ کو تقسیم ہند کے چند مناظر یا حالات ضرور یاد ہوں گے۔ آپ کے کیا احساسات تھے؟

ج: تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں میں نے بھی مقدور بھر حصہ لیا۔ میں نے مسلم لیگ کے عظیم الشان جلسے دیکھے

ہیں اور بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کے جوش وخروش کے وہ مناظر اب بھی میری آنکھوں میں محفوظ ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے اوائل میں ملحقہ صوبہ سی. پی. کے بعض اضلاع اور ریاست گوالیار میں ہندو مسلم فسادات کے سلسلے میں ہزاروں مسلمانوں نے حیدرآباد دکن کے علاوہ بھوپال بھی ہجرت کی تھی۔ اس زمانے میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اسکول کے دیگر لڑکوں کی طرح میں نے بھی رضا کار مسلم لیگ کی حیثیت سے مہاجرین کا ریلوے اسٹیشن پر استقبال کیا اور انھیں لاریوں کے ذریعے عارضی اور مستقل ٹھکانوں اور کیمپ وغیرہ میں منتقل کرنے میں مقدور بھر حصہ لیا۔'' ۸

ان تینوں واقعات سے محسن بھوپالی کی شخصیت کی ایک جھلک ابھرتی ہے اور ان کے بچپن کی ایک تصویر ابھرتی ہے۔ وہ تصویر کچھ اس طرح ہے کہ محسن بھوپالی بچپن سے سماجی وسیاسی اعتبار سے سرگرم شخص تھے۔ ظاہر ہے اس وقت ان کی سیاست کیا تھی؟ ان کا سیاسی وسماجی نظریہ کیا تھا؟ یہ باتیں بہت اہم نہیں ہیں کیونکہ اس وقت ان کی عمر محض پندرہ سال یا اس سے بھی کم تھی۔ اس لیے اس کے نظریات پر بحث کرنا شاید بہت اہم نہ ہو کیونکہ اس عمر میں فکری پختگی کا عام طور فقدان پایا جاتا ہے؟ پندرہ سال کا نوجوان عام طور پر وہی سیاسی نظریہ رکھتا ہے جو اس کے گھر میں اور آس پاس ہوتے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ وہ سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں شامل اور سرگرم تھے۔ یہی سرگرمی بعد میں جب پاکستان بن گیا اور مسلم لیگ کا خواب شرمندہ ہو گیا۔ مسلم لیگ کا واحد خواب مسلمانوں کے لیے الگ ملک پاکستان بنانا تھا سو بن گیا۔ لیکن دقت یہ تھی مسلم لیگ نے اس امر پر اس وقت بہت زیادہ غور وفکر نہیں کیا تھا کہ مسلم ملک تو ہوگا لیکن کس قسم کا مسلم ملک ہوگا۔ اور بعد میں لوگوں کے خواب شکست بھی ہوئے شاید ان کے تصور میں مسلم ملک کا جو تصور تھا وہ کسی فکری یا شدید غور وخوض کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایک رومانوی تصور تھا اس کی کوئی ٹھوس تیاری نہیں تھی۔ ان خوابوں کی شکست کے بعد اس

زمانی کی دوسری اہم تحریک یعنی ترقی پسند تحریک کی طرف محسن بھوپالی راغب ہوئے۔

ان واقعات سے محسن بھوپالی کی ایک صفت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کھانے پینے کے بہت شوقین تھے۔ ملائی برف اور امرتی کھانے کا ذکر تو آ ہی گیا اور بعض جگہ اور بھی کھانے کا ذکر ہے۔ پہلے واقعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ محسن بھوپالی بچپن میں بہت شوخ تھے بعد میں یہ شوخی ان کی شاعری میں مزاح کی شکل میں ابھری لیکن یہ مزاح بھی بعد میں ان کے طنز میں نمایاں ہوئی۔ جو بہت واضح تو نہیں ہے لیکن ان کی شخصیت کی تہوں میں جاری وساری رہی۔

ابتدائی تعلیم:

محسن بھوپالی کی ابتدائی تعلیم بھوپال میں حبیبیہ مڈل اسکول اور الیگزینڈر راہائی اسکول میں ہوئی، اس کے بعد وہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ اس سلسلے میں نزہت انیس لکھتی ہیں۔

> ''آپ نے چھٹی تک بھوپال کے حبیبیہ اسکول اور آٹھویں تک الیگزینڈر رہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔''۹

کئی دیگر وسائل سے بھی ان کی ابتدائی تعلیم انھیں دونوں اسکولوں سے ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے لاڑکانہ (سندھ، پاکستان) میں ہی تعلیم حاصل کی۔ بھوپال یا ہندوستان کے کسی بھی اور اسکول کا ذکر نہیں ملتا۔

اپنے اسکول کے دنوں میں ہی وہ سیاسی وادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے تھے۔ جیسا کہ اوپر درج کیا جا چکا ہے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز اسکول کے دنوں میں ہی ہو گیا تھا۔ مسلم لیگ کی میٹنگز میں حصہ لینے سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ اسکول کے دنوں میں ہی سیاسی وسماجی تنظیموں سے بھی وابستہ ہو گئے تھے لیکن اسکول کے دنوں میں محسن بھوپالی پڑھائی میں کیسے تھے اس کا کوئی براہِ راست ذکر نہیں ملتا۔

محسن بھوپالی جس وقت لاڑکانہ، پاکستان پہنچے مڈل پاس کر کے گئے تھے لیکن

اس وقت لاڑکانہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں اردو کی تعلیم کا انتظام نہ تھا۔ اس سلسلے میں نزہت انیس مزید روشنی ڈالتی ہیں۔

''لاڑکانہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں کیونکہ اردو نہیں تھی اس لیے آپ کے والد نے آپ کو اپنے محکمے کے دوست عبدالحمید خان کے پاس حیدرآباد (سندھ) بھیج دیا تھا جہاں آپ کو غلام حسین ہدایت اللہ اسکول میں نویں جماعت کے بجائے آٹھویں جماعت میں داخلہ مل گیا۔ ۱۹۴۸ء میں مہاجر اساتذہ کی آمد کی وجہ سے گورنمنٹ ہائی اسکول لاڑکانہ میں بھی اردو تعلیم کا آغاز ہو گیا تھا جب آپ آٹھویں جماعت پاس ہونے کا سرٹیفکٹ لے کر گورنمنٹ ہائی اسکول پہنچے تو علم ہوا کہ ''غلام حسین ہدایت اللہ اسکول'' محکمۂ تعلیم سے منظور شدہ نہیں ہے چنانچہ ایک بار پھر آپ کو آٹھویں جماعت میں ہی تعلیم حاصل کرنا پڑی۔''[۱۰]

انھوں نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی اسکول لاڑکانہ (سندھ) سے ۱۹۵۱ء میں پاس کیا اور انٹر گورنمنٹ کالج لاڑکانہ سے ۱۹۵۴ء میں انٹر میں کامیاب ہوئے۔ اگرچہ ثانوی اور سینیر ثانوی تعلیم کی مزید تفصیل نہیں ملتی لیکن کچھ چیزوں کی بالواسطہ تفصیل ملتی ہے۔ محسن بھوپالی اس کے بعد ڈپلومہ انجینیرنگ کیا جس سے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے سائنسی مضامین کی تعلیم حاصل کی ہوگی اور یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اسکولی پڑھائی میں بھی اچھے رہے ہوں گے۔ وگرنہ اس زمانے میں انجینیرنگ میں داخلہ ملنا کوئی آسان بات نہ تھی۔

ترکِ وطن:

محسن بھوپالی کے والد تقسیم ہند کے وقت ہندوستان کی مرکزی حکومت کے محکمۂ ڈاک و تار میں ملازم تھے تقسیم کے وقت تمام مسلم ملازمین کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ

چاہیں تو ہندستان میں رہ سکتے ہیں یا پاکستان میں بھی جا کر اپنی ملازمت جاری رکھ سکتے ہیں۔ اس وقت جو افراتفری کا ماحول تھا ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کو لے کر طرح طرح کے سوال اٹھائے جا رہے تھے ایسے میں محسن بھوپالی کے والد حاجی محمد عبدالرزاق نے پاکستان میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ لیا۔ اس وقت محسن بھوپالی کی عمر محض پندرہ برس کی تھی اس لیے وہ اپنے والد کے ہمراہ پاکستان چلے گئے۔ ان کی ہجرت میں خود ان کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ اس سلسلے میں نوائے وقت کے لیے نسیم نقوی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔

> ''۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی جونکہ والد صاحب محکمۂ ڈاک میں ملازم تھے اور انھوں نے پاکستان جانا منظور کیا تھا اس لیے میں اہل خانہ کے ساتھ پاکستان آ گیا۔''[11]

مشہور اخبار 'جنگ' کے نمائندے، سرور ساجد کو دیے گئے ایک انٹرویو میں جب محسن بھوپالی سے یہ سوال پوچھا گیا کہ۔

> ''سوال: آپ کی یہ تلخ نوائی کیا اس ماحول کا نتیجہ تھی جو ہجرت کے بعد آپ کو ملا؟ سنا ہے اس زمانے میں لوگ مہاجرین کو پناہ گیر کہتے تھے۔
> محسن بھوپالی: نہیں پناہ گیر کہنے کی صورت حال بہت کم عرصے کے لیے اور بہت کم جگہوں پر تھی وگرنہ سندھ کے مقامی باشندوں نے مہاجروں کو کثیر محبت سے نوازا تھا۔''[12]

محسن بھوپالی کی ہجرت کے بارے میں نزہت انیں نے کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

> ''جون ۱۹۴۷ء میں مرکزی حکومت کے سرکلر کے مطابق ملازمین کو یہ اختیار (Option) دیا گیا تھا کہ وہ اپنے مستقبل کی سروس کے لیے ہندوستان میں رہنے یا حکومت پاکستان کی ملازمت کا فیصلہ کر سکتے ہیں چنانچہ والد صاحب اور تینوں بھائیوں نے پاکستان آنے کا اختیار

استعمال کیا۔ ستمبر ۱۹۴۷ء کے اوائل میں آپ کے والد بمع اہل خانہ پاکستان کے لیے روانہ ہوئے۔ پہلے بھوپال سے بمبئی پہنچے جہاں مہاجرین کو ٹھہرانے اور بذریعہ بحری جہاز کراچی پہنچانے کا انتظام تھا۔ بمبئی میں مسلمانوں کو ٹھہرانے کا انتظام بمبئی کے مسلمانوں نے صابو صدیق مسافر خانہ میں کیا تھا۔ وہاں تین دن رہنے کے بعد جہاز ایس ایس جل درگا میں آپ سب کو نشستیں ملیں۔ جہاز تیسرے دن کراچی پہنچا۔ یہاں ایک بڑے شیڈ میں ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ سرکاری ملازمین کی تعیناتی کے لیے دفتر بھی قائم کیا گیا تھا۔ آپ کے والد صاحب کو سکھر جانے کے احکامات ملے جہاں پہنچ کر لاڑکانہ پوسٹ آفس میں تعیناتی ہوئی اس طرح آپ کا خاندان ستمبر ۱۹۴۷ء کے آخر میں لاڑکانہ پہنچا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ جب کہ آپ کے بڑے چچا، منجھلے چچا اور چھوٹے چچا کی پوسٹنگ بالترتیب، کوئٹہ لاہور اور مکوال (گجرات) میں ہوئی۔[۱۳]

اس طرح محسن بھوپالی کا ہجرت کا سفر کافی پر سکون حالات میں گزرا۔ اگر چہ انھیں بھی ممبئی میں مسافر خانے میں رہنا پڑا، کراچی میں کچھ روز کیمپ میں رہے، طرح طرح کی افواہیں اور حقیقتیں مختلف ذرائع سے پہنچتی تھیں، اس پندرہ سالہ حساس اور نوخیز شاعر پر ان سب کا کیا اثر پڑا ہوگا؟ اور کس ذہنی آشوب سے گزرنا پڑا ہوگا؟ ان سب کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر سفر کی صعوبتیں بھی برداشت ہی کرنی پڑی ہوں گی۔ لیکن جو لوگ دہلی پنجاب ہو کر پاکستان گئے ان کو یہ سفر کافی مشکلات سے دو چار ہونا پڑا۔ بہتوں کو مال و اسباب ہی نہیں عزت و آبرو اور یہاں تک کہ جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ تو ان سب کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر محسن بھوپالی کی ہجرت کا ذکر کیا جائے گا تو اسے پر سکون سفر ہی کہنا پڑے گا۔ اگر چہ ممبئی میں بھی حالات بہت اچھے نہ تھے، وہاں بھی بہت سے لوگوں کو فسادات کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن یہ محض اتفاق

کہا جائے گا یا کچھ ان کے والد کا بطور سرکاری ملازم سفر کرنے کی وجہ سے یا قسمت کی یاوری بہر حال محسن بھوپالی کا سفر بہتوں کے مقابلے بہت آسانی سے گزر گیا۔ اس طرح تقریباً ایک ماہ طویل سفر جس کا ستمبر کے شروع میں آغاز ہوا تھا ستمبر کے اختتام تک وہ انجام تک پہنچ گیا اور انھوں نے سندھ کے شہر لاڑکانہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اس تعلق سے محسن بھوپالی نے خود روزنامہ جنگ کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔

''ہجرت کا دکھ میرے ہاں ذہنی سطح پر ہے۔ میں اور میرا خاندان ستمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان منتقل ہو گیا تھا اور کسی قسم کی معاشی بدحالی کے بغیر یعنی لٹی پٹی حالت میں نہیں بلکہ میرے والد اور تین چچا سرکاری سطح پر ملازمت میں Option کرنے کے بعد پاکستان منتقل ہوئے تھے۔''[۱۴]

محسن بھوپالی کی شاعری میں ہجرت اور اس کی تلخی کے اثر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ ممکن بھی نہیں ہے کہ ایک حساس شاعر نے جس وطن میں اپنی زندگی کے ابتدائی پندرہ برس گزارے ہوں اس وطن کو چھوڑ کے جانا پڑے، تو ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کا اثر نہ پڑے اس کی شاعری میں وطن سے بچھڑنے کا درد نہ ہو۔ محسن بھوپالی کی مشہور نظم 'گیس المیہ کے بعد' میں بھی کچھ نہ کچھ اس کا اثر نظر آتا ہے۔

گیس المیہ کے بعد

شہر بھوپال............اے ارضِ دارالسلام!
ایک مدت کے بعد آج پھر تجھ سے ہوں ہم کلام
سالہا سال کے فاصلے کاٹ کر
اپنے یاروں میں ہوں......اپنے پیاروں میں ہوں
شہر بھوپال اے ارضِ دارالسلام!
جس تباہی سے گزرے

ترے بچے بوڑھے......ترے مردوزن
اس کی تشبیہ تاریخ انسانیت میں نہیں
اس کے معنی کسی بھی لغت میں نہیں
......فکرِ انساں رسا ہے تو بس اس قدر
کچھ کہا، کچھ سنا ہے تو بس اس قدر
روزِ محشر سے پہلے قیامت کی شب آئی تھی
لے کے ہمراہ طوفانِ غیظ و غضب آئی تھی
ساتھ اپنے ہزاروں دھڑکتے دلوں کی صدا لے گئی
دعاؤں کو اٹھے ہوئے سارے دستِ دعا لے گئی
شہرِ بھوپال............اے ارضِ دارالسلام! [۱۵]

محسن بھوپالی کے یہاں اس قطعہ میں اور بہت سی غزلوں کے اشعار اور نظموں میں بھی ہجرت کسی نہ کسی شکل میں نظر آتی ہے لیکن محسن بھوپالی نے ہجرت کے اس دکھ کو ذات کا المیہ نہیں بنایا، اسے یاد کر کر کے رونے اور اداس ہونے کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ اس میں ایک تعمیری پہلو تلاش کر لیا۔ نغمہ، مہاجر سے خطاب اور لمحۂ فکریہ وغیرہ نظموں میں محسن بھوپالی کی اس وقت کی کیفیت کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ اگرچہ ان نظموں میں فکری گہرائی نہیں ہے لیکن ان کے اس وقت کے جذبات کی عکاسی ضرور ہے۔

لمحۂ فکریہ

یومِ آزادیٔ پاک ہے دوستو!
آج تزئین ہر بام و ایواں کرو
ذرہ ذرہ تجلی سے معمور ہو
قریے قریے کو رشکِ گلستاں کرو
خار و خس ہوں حریفِ گلاب و سمن
اس طرح اہتمامِ بہاراں کرو!

آج ہر موڑ پر مشعلیں نصب ہوں
کوچے کوچے میں جشن چراغاں کرو
ہاں مگر ایسے رنگین لمحات میں
یاد کر لو انھیں بھی جو تم میں نہیں
وہ جواں عزم پیرو زن و طفل و مرد
جن کے شوق شہادت پہ لاکھ آفریں
آج تک ناز کرتی ہے جن پر زمیں
وہ ستارے جو مٹی میں روپوش ہیں
ہے وطن جن کے پرتو سے مہر مبیں
راہ دے کر من و تو کے احساس کو
ان کے ایثار پر حرف آنے نہ دو
رنگ اور نسل کا تذکرہ چھیڑ کر
ان کے جذبوں کو بیکار جانے نہ دو
خطۂ پاک سے ہے تمھارا وجود
خطۂ پاک پر آنچ آنے نہ دو ۱۶؎

مزید تعلیم:

انجینیئرنگ میں ڈپلومہ:

انٹرمیڈیٹ کے بعد محسن بھوپالی نے سہ سالہ ڈپلومہ انجینئرنگ این.ای.ڈی.گورنمنٹ کالج، کراچی سے ۱۹۵۷ء میں کیا۔ اس وقت اس ادارے کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا بعد میں یہ ادارہ یونیورسٹی بن گیا۔

اردو میں ایم۔اے۔:

ڈپلومہ انجینیرنگ اور ملازمت کے ایک طویل عرصے بعد محسن بھوپالی نے ۱۹۷۹ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے۔ کیا اور دوسری پوزیشن کے ساتھ نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اس سلسلے میں اردو کے معروف ناقد اور اسلم فرخی فرماتے ہیں۔

"بدقسمتی سے ہمارے یہاں عام روش یہ ہے کہ علمی صلاحیت میں اضافے کی کوئی بھرپور کوشش نہیں کی جاتی جو کچھ حاصل کرنا تھا حاصل کرلیا اس کے بعد فرصت ہی فرصت۔ محسن کا انداز اس سے بالکل علیحدہ ہے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ انجنئر ہیں عمارتیں بنواتے ہیں۔ ماہر تعمیرات ہیں لیکن الفاظ کی عمارتیں تعمیر کرتے ہوئے انھیں احساس ہوا کہ ادبیات کا خصوصی مطالعہ بھی ضروری ہیں چنانچہ انھوں نے اردو میں ایم۔اے۔ کرنے کا منصوبہ بنایا یونیورسٹی کے حوالے سے میرے پاس ایسے بہت سے افراد آتے ہیں جو ایم۔اے۔ کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں اور مناسب رہنمائی چاہتے تھے۔ میں تابمقدور اس کا وعدہ کرتا تھا لیکن ثابت قدم رہنے والے بہت کم ہوتے تھے۔ محسن نے جب ایم۔اے۔ کرنے کا خیال ظاہر کیا دل میں نے خاصی بدگمانی کے ساتھ مدد کا وعدہ کیا دل میں خیال تھا کہ مصروف آدمی ہیں ممتاز شاعر ہیں دفتر میں مصروف رہتے ہیں جو وقت بچتا ہے مشاعروں کی نذر ہو جاتا ہے یہ کہاں اور وبال علم کہاں مگر محسن نے یہ کمال کردکھایا کہ برائے رہنمائی کے باوجود انھوں نے بڑے ٹھاٹ سے ایم۔اے۔ کیا اور جامعہ میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔" [۱۷]

اس طرح نہ صرف محسن بھوپالی نے ایم۔اے۔ کیا بلکہ کراچی یونیورسٹی میں

دوسری پوزیشن بھی حاصل کی جب کہ اس وقت محسن بھوپالی کی شہرت بطور شاعر دور دور تک پھیل چکی تھی۔ پھر بھی انھیں داخلہ لے کر تعلیم حاصل کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ اس سے ان کی علم کی پیاس اور اردو سے محبت دونوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ صحیح معنی میں طالب علم بنے رہنے میں یقین رکھتے تھے۔ اردو میں ایم. اے. کرنے کے بعد محسن بھوپالی نے صحافت میں ایم اے کرنے کے لیے اردو کالج میں داخلہ لیا اور سال اول کامیابی کے ساتھ مکمل کیا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا سال دوم کے امتحان کے دوران کینسر کا مرض تشخیص ہوا جس کے مشکل علاج کی وجہ سے باقی دو پیپر نہ دے سکے۔ اور صحافت میں ایم اے نامکمل رہ گیا۔

ملازمت اور وظیفہ حسن خدمات:

محسن بھوپالی خوش قسمت تھے کہ ان کو جون ۱۹۵۲ء میں ہی ملازمت مل گئی اس سے ظاہر ہے کہ اس وقت وہ ابھی ۲۰ سال کے بھی پورے نہیں ہوئے تھے اور ہائی اسکول تک کی تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ انٹرمیڈیٹ انھوں نے ۱۹۵۴ء میں پاس کیا تھا۔

> ''۱۲ جون ۱۹۵۲ء میں آپ نے بہ حیثیت اورسیئر محکمۂ تعمیرات حکومتِ سندھ میں ملازمت اختیار کی۔'' ۱۸

محسن بھوپالی نے شاعری میں جس طرح کامیابی حاصل کی، ملازمت میں وہ کامیابی ان کو حاصل نہ ہو سکی، اس سلسلے میں سلطان جمیل نسیم لکھتے ہیں۔

> ''اگر ان کی ملازمت کے سلسلے میں نظر ڈالی جائے تو معاملہ برعکس نظر آتا ہے۔ یعنی 60 میں جس عہدے پر کام کر رہے تھے۔ وہاں سے ترقی نومبر 1991ء میں پائی۔'' ۱۹

جب کہ اگر وہ کوشش کرتے تے شاعری کے ذریعے انھوں نے جو شہرت حاصل کی تھی اس کا سہارا لے کر ملازمت میں بھی بہت ترقی حاصل کر سکتے تھے لیکن ان

کے ضمیر نے اس بات کو گوارہ نہیں کیا۔ اور وہ ایک طویل عرصے تک بغیر کسی ترقی کے ایک ہی عہدے پر کام کرتے رہے اور آخر کار بہ حیثیت ایگزیکٹو انجینئر گریڈ ۱۹، ۲۸ جولائی ۱۹۹۳ء میں انھیں حسن خدمات سے وظیفہ حاصل ہو گیا ہفت روزہ معیار کراچی سے گل زیب زیبا کو دیے گئے ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا تھا۔

"میں ۲۸ جولائی ۱۹۹۳ء میں تقریباً ۴۱ سال حکومت سندھ کے محکمۂ تعمیرات میں ملازمت کرنے کے بعد رٹائر ہو چکا ہوں اور اپنے دوست اور سندھی کے نامور افسانہ نگار غلام نبی مغل کے بقول 'باعزت بری ہو چکا ہوں اور یہ سچ بات بھی ہے کہ اب میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا ہوں۔ گھریلو ذمہ داریاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔"[۲۰]

اس طرح انھوں نے ایک کامیاب پیشہ ور انجینئر کے طور پر زندگی گزار دی، اگرچہ ان کا اولین مشغلہ شاعری تھا لیکن محسن بھوپالی نے دونوں جگہوں پر ایک کامیاب زندگی گزاری۔

شادی:

محسن بھوپالی کی شادی ۱۹ فروری ۱۹۵۶ء میں محترمہ مقبول کشور سے ہوئی جو محسن بھوپالی کی رشتہ دار تھیں اور مقبول کشور کی ماں محسن بھوپالی کی پھوپھی لگتی تھیں جن کا تعلق ہوشنگ آباد کے سادات خاندان سے تھا۔ مقبول کشور کا خاندان ۱۹۵۱ء میں ہوشنگ آباد سے پاکستان ہجرت کر کے گیا اور اس خاندان نے کراچی میں سکونت اختیار کی۔ لیکن دونوں خاندانوں کو ایک دوسرے کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا کہ کون کب پاکستان آیا اور کس نے کہاں سکونت اختیار کی ہے۔ چونکہ محسن بھوپالی ۱۹۵۲ء سے ہی سرکاری نوکری میں تھے اور ایک معقول تنخواہ پر تھے، اس زمانے میں انھیں ۱۰۴ روپے تنخواہ میں مل رہی جو ایک بڑی رقم سمجھی جاتی تھا۔ اس لیے ان کے والد کو محسن بھوپالی کی شادی کی فکر بھی ہو رہی تھی۔ دہلی کے کچھ خاندانوں کے بارے میں اس وقت یہ مشہور

تھا کہ وہ لوگ شادی کے وقت اسٹامپ پر لکھوا لیتے ہیں کہ آدھی تنخواہ لڑکی کو ملے گی۔
ابھی وہ لوگ اسی کشمکش میں تھے کہ اسی دوران ایک عزیز کے ذریعے دونوں خاندانوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی کہ محسن بھوپالی کے خاندان کے لوگ لاڑکانہ اور مقبول کشور کے خاندان کے لوگ کراچی میں رہ رہے ہیں تو محسن بھوپالی کے چچا مقبول کشور کے خاندان سے ملنے کراچی گئے دونوں خاندان کے لوگ ایک طویل عرصے بعد مل کر بہت خوش ہوئے۔ اسی دوران چچا نے مقبول کشور کو بھی دیکھا۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد چچا نے اپنے بھائی کو پھوپھی کے خاندان کے بارے میں بھی بتایا اور یہ بھی اطلاع دی کہ ان کی بیٹی محسن بھوپالی کے لیے معقول ہے۔ کیوں دہلی والوں میں لڑکی تلاش کر رہے ہو۔ اس کے بعد محسن بھوپالی کی والدہ اپنی نند کے گھر گئیں اور تقریباً ایک ہفتہ وہیں قیام پذیر رہیں اور جب انھوں نے ہر طرح سے مقبول کشور کو دیکھ بھال لیا اور سمجھ لیا، تب انھوں نے شادی کی تجویز رکھی۔ مقبول کشور کے والدین نے بخوشی قبول کر لیا۔

شادی طے ہونے کے بعد منگنی ہوگئی اور تقریباً ایک سال بعد شادی ہوئی لیکن اس دوران نہ منگنی سے پہلے اور نہ منگنی کے بعد ہی دونوں نے نہ ایک دوسرے کو براہ راست دیکھا اور نہ ہی کوئی تصویر وغیرہ دیکھی۔ اس طرح ایک سال بعد شادی ہوئی تو کافی دھوم دھام سے ہوئی محسن بھوپالی کی بارات لاڑکانہ سے کراچی گئی۔ دونوں خاندانوں میں خوب دھومیں ہوئیں، ہفتوں پہلے ڈھولک وغیرہ بج رہی تھی، ساری رسمیں خوب دھوم دھام سے مکمل ہوئیں۔ جہیز کا رواج تو اس وقت بھی تھا جہیز کا دکھاوا نہیں کیا جاتا تھا اور جہیز میں بھی بیشتر برتن اور گھریلو استعمال کی چیزیں ہوتی تھیں جو محسن بھوپالی کو بھی دی گئیں۔ اس وقت ریڈیو سننے کا بڑا شوق ہوا کرتا تھا تو انھیں جہیز میں ایک ریڈیو بھی دیا گیا تھا۔

اس طرح دونوں کی شادی مکمل ہوگئی دونوں خاندان مذہبی تھے اور گھر میں پردے کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس وقت مشترکہ خاندان ہوا کرتے تھے مقبول کشور

گھر کے تمام مردوں سے پردہ کرتی تھیں۔ محسن بھوپالی کی شادی شدہ زندگی تمام عمر خوش گوار رہی۔ کبھی دونوں میں کوئی نا اتفاقی نہیں ہوئی، معمولی شکوہ شکایت تو الگ بات ہے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ روٹھ کر میکے چلی گئی ہوں یا گھر میں کئی دنوں تک روٹھی رہی ہوں۔ محسن بھوپالی کے ادبی ذوق کی وجہ سے بہت امکان تھے اکثر مشاعروں اور ادبی محفلوں میں رہتے اور دیر رات سے گھر واپس آتے اکثر دوسرے شہروں میں مشاعروں میں شرکت کرنے جاتے۔ کبھی ایسی جگہ تبادلہ ہوا کہ وہاں بیوی کو ساتھ رکھنا مشکل تھا تو ان کے بغیر بھی رہنا ہوا لیکن ان سب حالات کو مقبول کشور نے بڑی ہنسی خوشی برداشت کیا اور ان کے ادبی ذوق کو پروان چڑھنے کے لیے وہ ہر طرح کا ماحول فراہم کرتی رہیں۔

اولادیں:

محسن بھوپالی اور مقبول کشور کے چھ اولادیں ہوئیں جن میں سے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ جن کی تفصیل مع ان کی تعلیمی لیاقت کے حسب ذیل ہے۔

"۱۔ شہانہ جاوید — بی ایس سی
۲۔ رخسانہ انور علی — بی اے
۳۔ میجر راشد محسن — بی اے
۴۔ ارشد محسن — بی ای (این ای ڈی) وایم اس، لور پول (برطانیہ)
۵۔ شاہد محسن — بی ای (این ای ڈی)
٦۔ ثاقب محسن — بی ای (این ای ڈی) وایم ایس وین اسٹیٹ یونیورسٹی (یو ایس اے)"[۲۱]

اس طرح محسن بھوپالی کی تمام اولادیں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، شادی شدہ ہیں اور ایک خوش حال زندگی گزار رہی ہیں ہفت روزہ معیار کو ملازمت سے سبک دوش ہونے

کے بعد دیے گئے ایک انٹرویو میں انھوں نے اپنی اولادوں کے بارے میں کہا تھا۔

> ''گھریلو ذمہ داریاں نہ ہونے کے برابر ہیں ماشاء اللہ بیٹے اور بہوئیں ہم میاں بیوی کے ساتھ ہی رہتے ہیں اور اپنی ذمہ داریاں نہایت ذمہ داری سے ادا کرتے ہیں۔'' ۲۲

محسن بھوپالی کی اولادوں میں اخلاق وآداب میں اپنے والد سے کافی اثر قبول کیا ہے۔

شخصیت:

محسن بھوپالی ایک بہت ہی دلکش شخصیت کے مالک تھے، ان کے بارے میں لکھنے والے بیشتر احباب نے جب ان کی شاعری کے بارے میں قلم اٹھایا ہے تو اکثر ان کی شخصیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ سلطان جمیل نسیم نے اپنے ایک مضمون میں ان کی تجسیم کا بھی ذکر کیا ہے۔ محسن بھوپالی کا قد درمیانہ تھا، رنگت سانولی، اکہرا بدن، لیکن نین ونقش بہت دل آویز، اور اس سے بھی دل کش ان کی آواز تھی، بقول سلطان جمیل نسیم۔

> ''تیکھے نقش ونگار، گہرا سانولا رنگ، آنکھوں میں مقناطیسی کشش، تیئس چوبیس سال کا ایک نوجوان سفید شیروانی میں ملبوس اپنی پاٹ دار آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دے اپنا کلام سنا رہا تھا۔'' ۲۳

اس کے علاوہ ان کے کئی کتابوں اور ان پر شائع ہونے والے رسالوں کے خصوصی گوشوں میں بھی ان کی کئی تصویریں بھی شائع ہوئی ہیں، ان تصویروں سے بھی ان کی جسامت کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بیشتر تصویریں ان کے ادبی احباب کے ساتھ کی ہیں حق بات تو یہ ہے کہ کسی کی بھی شخصیت کا جب تک اس کے احباب کے بارے میں نہ معلوم ہو تب تک کسی کی شخصیت کا صحیح اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ دراصل ان کی شخصیت اور ان کی شاعری کی دوئی مٹ گئی ہے اور وہ جس

طرح کے شخص تھے اسی طرح کی شاعری کرتے تھے۔ جس طرح ان کی شاعری میں دلیری اور ہمت نظر آتی ہے کہ وہ بات کہتے وقت کوئی بھی دباؤ خوف محسوس نہیں کرتے اسی طرح ان کی شخصیت بھی واضح دلیر اور بے خوف ہے۔ پاکستان کے معروف ناقد و دانشور اسلم فرخی ان کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''محسن ایک ہمدرد، شریف اور مخلص دوست کی حیثیت سے نمایاں رہے۔ ان کے کردار میں نمایاں وصف ان کی وضع داری ہے۔ ......ان کا قاعدہ یہ ہے کہ تسلسل اور تواتر سے اپنے دوستوں سے ملتے رہتے ہیں۔ اس ملنے جلنے میں ان کی طرف سے کبھی کوئی بے اصولی یا تاخیر نہیں ہوتی نہ وہ جوابی کاروائی کے متمنی رہتے ہیں۔ ......محسن کے رویہ میں کبھی کوئی فرق نہیں پڑا وہ ہمیشہ کی طرح آتے ہیں نسیم بہار کے جھونکے کی طرح، خوشبو کی ایک لہر بن کر، وقت ہوا تو کچھ دیر بیٹھ گئے، کچھ ادبی باتیں ہوئیں اور اگر وقت زیادہ نہیں ہے تو صاحب سلامت ہوئی اور محسن رخصت مگر ایک بڑے خوشگوار اور دلنواز تاثر کے ساتھ۔

محسن مستقل مزاج اور دلیر انسان ہیں خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتے ہیں۔......ان کی دلیری کا اندازہ ان کی علالت سے ہوا جن دنوں وہ ڈاکٹر جلیسی کے زیر علاج تھے اور سول ہسپتال آتے تھے تو اکثر انجمن بھی آجاتے تھے اس سارے عرصے میں محسن نے کبھی کسی گھبراہٹ کا یا مایوسی مظاہرہ نہیں کیا بڑی ہمت اور دلیری سے معالجے میں مصروف رہے۔ انگلستان جانے سے پہلے بھی ان سے ملاقات ہوئی تھی، پرامید تھے، مطمئن تھے، ان دنوں بھی خوش اور مطمئن ہیں۔''[۲۴]

اسلم فرخی اور محسن بھوپالی کا تعلق ۱۹۴۸ء میں شروع ہوا اور تا حیات جاری رہا

کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی کہ جس سے تلخی پیدا ہو۔ انھوں نے محسن بھوپالی کی شخصیت کی جو چند نمایاں خصوصیات بتائی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جس سے ایک بار دوستی کر لیتے ہیں اسے ایک شریف، پر خلوص اور وضع دار انسان کی طرح حتیٰ الامکان نبھاتے ہیں۔ نہ صرف نبھاتے ہیں بلکہ کسی نہ کسی طرح سے ملاقات کا سلسلہ بھی جاری رکھتے ہیں اگر دوست ان سے ملنے نہ بھی آئے تو بھی وہ اس کا حساب نہیں لگاتے اور دوستی نبھائے جاتے ہیں اور ان سے ہر ملاقات ایک خوش گوار اور صبح نسیم کے جھونکے کی طرح ہوتی ہے، ان سے کبھی اکتاہٹ نہیں ہوتی ہے۔ دوسری اہم صفت یہ بتائی ہے کہ وہ ایک مستقل مزاج اور نہایت دلیر اور باہمت انسان ہیں۔

حسن ظہیر جعفری محسن بھوپالی کے دیرینہ دوست ہیں، ان دونوں کی دوستی حیدرآباد، سندھ کے زمانے سے تھی جب حیدرآباد کی ادبی نشستوں میں دونوں کی ملاقات مستقل ہوتی رہتی تھی، پھر محسن بھوپالی اور حسن ظہیر نے مل کر ''زاویے'' رسالہ بھی نکالا تھا۔ انھوں نے بھی محسن بھوپالی کی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے محسن بھوپالی کی دردمندی، حاضر جوابی، لطیفہ بازی اور حق گوئی میں بے باکی کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''محسن ایک انسان کی حیثیت سے بے حد درد بھرا دل رکھتے ہیں۔
> بے حد حاضر جواب ہیں۔ حق اور سچی بات کہنے میں کوئی رکاوٹ
> بھی انھیں نہیں روک سکتی ہے۔ لطیفہ بازی میں بھی ان کا جواب
> نہیں ہے۔'' [۲۵]

اسی طرح محسن بھوپالی کے کئی احباب اور جاننے والوں نے ان کی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ہر ایک نے اپنے اعتبار سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ سلطان جمیل نسیم نے محسن بھوپالی کی اس خوبی کو بہت اہمیت دی ہے کہ وہ مخالفین کے بھی بدخواہ نہیں ہیں، ان کی بھی برائی وہ برداشت نہیں کر پاتے ہیں۔ اور جہاں تک بات دوستوں کی ہے تو وہ ان سے ہر حال میں نبھاتے ہیں۔ کسی

بھی حد تک اپنی طرف سے وہ کبھی کسی سے تعلقات نہیں توڑے، وہ ان کی زندہ دلی کی بھی تعریف کرتے ہیں لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے ان کو بیٹری کو ہاتھ سے دبا کر بات کرتے دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے۔ شوکت عابدی نے محسن بھوپالی کے ساتھ کے جوانی کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے ایک جملہ لکھا ہے جو کبھی صمد رضوی ساز نے محسن بھوپالی اور شوکت عابدی دونوں کے لیے کہا تھا، ان لوگوں کی جوانی بہت بے داغ ہے۔ اس سلسلے میں محسن بھوپالی نے بھی اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ مجھے کبھی کسی لڑکی سے عشق نہیں ہوا۔

گلنار آفرین جن کے ساتھ مل کر محسن بھوپالی نے شعری مجموعہ شہر آشوب کراچی ترتیب دیا تھا ان کا ماننا ہے کہ وہ بہت کم جملوں میں اپنی بات ادا کر دیتے ہیں، مدد کر کے جتاتے نہیں ہیں اور بہت ہی حساس، جذباتی اور ذہین شخص ہیں، برجستہ جواب دے کر سب کو لاجواب کر دیتے ہیں اور ہر موقعے کے لیے بے شمار اشعار یاد رہتے ہیں، اکثر کسی بات کا جواب یا کوئی بات شعر میں بھی کہہ جاتے ہیں۔ نسیم نقوی نے محسن بھوپالی کی شخصیت کے بارے میں ایک جملہ لکھا ہے۔ جو ان کی شخصیت کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے اور انسانیت کا اصل جوہر بھی یہی ہے۔ وہ جملہ اس طرح ہے۔

> ''اپنی ذات کے حصار میں وہ کبھی اسیر نہیں ہوئے کہ اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں دوسروں کے لیے جینا انسانی عظمت کی دلیل ہے۔''[۲۶]

شعر گوئی کا آغاز:

محسن بھوپالی نے شعر کہنے کا آغاز بہت کم عمری میں شروع کر دیا تھا، ابھی وہ تقریباً ۱۳ یا چودہ سال کے ہی ہوئے تھے کہ انھوں نے اشعار موزوں کرنے شروع کر دیے تھے اس سلسلے میں انھوں نے نوائے وقت کے لیے نسیم نقوی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں خود کہا تھا۔

''میری ادبی زندگی کا آغاز ہائی اسکول کے زمانے سے ہی ہو گیا تھا۔

بھوپال میں ۴۶-۱۹۴۵ء میں جب میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا تو میں اپنے دوست محمد محسن کے ساتھ ریلوے انڈین انسٹیٹیوٹ کی لائبریری جایا کرتا تھا۔ وہاں ماہ نامہ عالم گیر، ادب لطیف، ساقی، افکار اور ہفت روزہ خیام اور ریاست وغیرہ آیا کرتے تھے۔ میں ان پرچوں میں شائع ہونے والی غزلوں اور نظموں کو سب سے پہلے پڑھتا اور سوچتا کہ ایسا تو میں بھی لکھ سکتا ہوں پھر اس شوق کو مہمیز اس انسٹیٹیوٹ میں ہونے والی شعری نشستوں سے بھی ملی جن میں اسد بھوپالی، عرشی بھوپالی، منظر سیمابی اور دیگر شعرا شرکت کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں میں نے صدر منزل بھوپال اور نواب صاحب کی سالگرہ پر ہونے والے مشاعروں میں بطور سامع شرکت کی۔ گاہے گاہے کچھ کہنے کے شوق میں اشعار بھی موزوں کرنے لگا۔ اس دوران بچوں کی نظمیں بھی لکھیں۔" ۲۷

ابھی محسن بھوپالی کی شعر گوئی اپنے ابتدائی مراحل میں ہی تھی کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کا سانحہ ہو گیا اور وہ اپنے والد کی ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اگر چہ انھیں اس ہجرت میں کوئی بہت زیادہ تکلیفوں کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا۔ خاص طور سے وہ فسادات سے محفوظ رہے۔ لیکن نفسیاتی، ذہنی اور وطن سے بچھڑنے کا دکھ تو اٹھانا ہی پڑا۔ دراصل انھیں اپنے بچپن کے دوست محمد محسن سے بچھڑنے کا زیادہ احساس تھا جو بعد میں ان کے تخلص سے ظاہر ہوا۔ اس ہجرت کے بعد محسن بھوپالی اپنے والد کے ہم راہ پاکستان چلے گئے اور لاڑکانہ میں سکونت اختیار کی۔ لاڑکانا صوبۂ سندھ میں آتا ہے اور یہاں کی بنیادی زبان سندھی تھی لیکن پاکستان میں قومی زبان چونکہ اردو بنائی گئی تھی اس لیے جلد ہی اردو کے لیے حالات سازگار بننے لگے اور یہاں اردو کی ادبی سرگرمیوں کا بھی آغاز ہو گیا۔ اس سلسلے میں وہ خود کہتے ہیں۔

''یہاں شعروادب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب نے بزم ادب
قائم کی اس طرح میری باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ہوا اور وہاں
۱۹۴۸ء سے میرا کلام ملک کے مختلف اخبارات اور رسائل میں
شائع ہونا شروع ہوا۔''۲۸

ابتدائی کچھ برسوں کا کلام بنیادی طور پر بچوں کی نظمیں تھیں کچھ غزلیں وغیرہ بھی کہیں لیکن ظاہر ہے غزل کی صنف جس گہرائی وگیرائی کا تقاضا کرتی ہے وہ شاید اس میں ابھی آنی باقی تھی۔ اسلم فرخی نے ۱۹۴۸ء کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اس وقت شمس تبریزی کے تعاون سے بچوں کا رسالہ ''میرا رسالہ'' نکالتے تھے، محسن اس وقت بچے تھے اور بچوں کی نظمیں لکھتے تھے اور اس رسالے کے شاعروں میں شامل تھے۔

تخلص:

محسن بھوپالی نے شروع میں زیبا بھوپالی تخلص رکھا تھا۔ لیکن اس وقت کئی اور شاعروں کا بھی یہی تخلص تھا اس لیے ایک کا کلام دوسرے کا سمجھ کر پڑھ لیا جاتا تھا پھر ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ کئی دوست احباس یہ کہہ کر چڑاتے تھے کہ زیبا تو خواتین کا نام ہوتا ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنا نام بدل کر محسن رکھ لیا، محسن ان کے بچپن کے بہت عزیز دوست کا نام تھا جو انھیں پسند بھی بہت تھا اس لیے انھوں نے محسن بھوپالی نام رکھ لیا۔
۱۹۴۹ء یا ۱۹۵۰ کا ایک واقعہ ہے محسن بھوپالی کے والد محمد عبدالرزاق نے جب بیٹے کو اکثر فکرِ شعر میں گم دیکھا تو انھیں تشویش ہوئی کہ اور انھوں نے بزم ادب لاڑکانہ کے صدر صمد رضوی ساز سے ملاقات کی اور پوچھا کہ میرا بیٹا رحمٰن شاعری ٹھیک ٹھاک کرتا ہے یا ایسے ہی وقت ضائع کر رہا ہے؟ آپ کہیں تو اسے سختی سے منع کر دیں، اس پر صمد رضوی ساز نے محسن کے والد سے کہا مولانا آپ اسے ہرگز منع نہ کریں وہ ایک دن شاعری میں نام پیدا کرے گا۔

جب محسن بھوپالی کا پہلا مجموعۂ شاعری شکستِ شب شائع ہوا تو اس میں ۱۹۵۱ء

سے قبل کی شاعری نہیں تھی۔ ایک طویل عرصے بعد یہ ابتدائی کلام موضوعاتی نظموں کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں یوں تو ان کی شاعری کا آغاز قیامِ بھوپال کے زمانے میں ہی ہو گیا تھا لیکن ان کی شاعری کا باضابطہ آغاز جس میں گہرائی و گیرائی بھی ہے اور جسے بعد میں بھی دنیا کے سامنے پیش کرنے میں انھیں کوئی جھجک نہیں ہوئی اس شاعری کا آغاز ۱۹۵۱ء سے ہوا۔

رشتۂ تلمذ:

محسن بھوپالی نے جب شعر کہنے کا آغاز کیا تو شروع میں بیشتر بچوں کی نظمیں کہیں، یہ بچوں کی نظمیں باقاعدگی کے ساتھ رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتی تھیں، اس وقت محسن بھوپالی کا کوئی استاد نہ تھا جس سے وہ اصلاح لیتے ہوں، لیکن جب سنِ بلوغت کو پہنچے اور بڑے لوگوں کے لیے شعر کہنے لگے تو انھوں ایک استاد کی ضرورت سمجھی اور وہ سیماب اکبرآبادی سے اصلاح لینے لگے۔ کچھ عرصے تک ان سے اصلاح لینے کے بعد محسن بھوپالی انھیں کے شاگرد صبا متھرادی سے اصلاح لینے لگے جو اب خود ایک استاد شاعر کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ لیکن یہ استادی اور شاگردی کا سلسلہ بس ۱۹۵۰ سے ۱۹۵۱ء تک ہی چلا اس کے بعد محسن بھوپالی نے کسی سے اصلاح کی ضرورت نہیں سمجھی۔

ادبی اور شعری سرگمیاں:

محسن بھوپالی نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ ایک مختلف ادبی و سماجی تنظیموں کے سرگرم رکن بھے تھے۔ جب انھوں نے لاڑکانہ میں سکونت اختیار کی تو وہاں اردو کا ماحول بہت سازگار نہ تھا خاص طور سے ادبی سرگرمیاں بہت کم تھیں۔ محسن بھوپالی اور دوسرے احباب نے مل کر ایک بزمِ ادب قائم کی جس میں نہ صرف شعری نشستوں انعقاد کیا جاتا بلکہ نشستوں میں پڑھی جانے والی شاعری، اچھی شاعری پر گفتگو بھی ہوئی گئی بات تنقیدی نشستوں کا بھی انعقاد کیا جاتا۔ کئی بڑے مشاعروں کو بھی اس بزم نے

انعقاد کیا۔ جس میں کل سندھ اور کل پاکستان مشاعرے بھی شامل ہیں۔ انھیں مشاعروں میں محسن بھوپالی کو کئی ایسے دوست ملے جو طویل عرصے تک ان کے ادبی اور ذاتی دوست بنے رہے۔ جن ادبی تنظیموں میں وہ مختلف حیثیت سے منسلک رہے ان کی ایک فہرست حسب ذیل ہے۔

"جوائنٹ سیکریٹری بزم ادب لاڑکانہ (۵۰۔۵۷ء)
سیکریٹری بزم اقبال، گورنمنٹ کالج، لاڑکانہ (۵۴-۵۵ء)
رکن علاقائی مجلس عاملہ رائٹرز گلڈ (۶۲-۶۵ء)
رکن مرکزی مجلس عاملہ رائٹرز گلڈ (۶۵-۷۰ء)
ایگزیکٹو سیکریٹری گلڈ (۱۹۷۰ء)
رکن صوبائی مجلسِ عاملہ، رائٹرز گلڈ (۷۵-۸۰ء)
کنوینر مجلس یادگار قابل (۶۲-۶۸ء)
جنرل سیکریٹری، ایوان ادب، کراچی (۶۵-تاحیات)
ممبر گورننگ باڈی، آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی (۱۹۹۵ء)
چیئرمین، ادبی کمیٹی، آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی (۱۹۹۵ء)" ۲۹

اس فہرست سے ظاہر ہے کہ محسن بھوپالی تقریباً تمام عمر مختلف تنظیموں سے وابستہ رہے۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان کی تنظیموں سے وابستگی بہت شروع سے ہی جب وہ لاڑکانہ، سندھ میں سکونت اختیار کی تھی اسی وقت سے وہ بزم ادب سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہ فکر اور مزاج دونوں اعتبار سے ایک مجلسی شخص تھے، تنہائی ان کے مزاج میں تھی اور نہ ان کی ترقی پسند فکر ہی انھیں ایسا کرنے کو کہتی تھی۔ ان تنظیموں نے جو ادبی نشستیں، مشاعرے اور مباحث کروائے ان کے ذریعے خود محسن بھوپالی اور دوسرے بہت سے شعرا اور ادیب کو ایک صحیح سمت و رفتار ملی۔ خاص طور سے نئے ادیبوں کی ان کے ذریعے بہت حوصلہ افضائی ہوئی۔

رسالوں میں کلام کی اشاعت اور کتب:

'شعر گوئی کا آغاز' کے عنوان کے تحت میں پہلے ہی عرض کر چکی ہوں کہ محسن بھوپالی کی شاعری کا آغاز بھوپال میں ہی ہو گیا تھا، لیکن وہ بنیادی طور پر واقعات اور احساسات کا ایک منظوم ردِ عمل ہوتا تھا اس میں فکر و فن کی وہ گہرائی نہیں تھی اور پندرہ برس کے نوجوان سے توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن جب وہ تمبر میں پاکستان آئے تو پرانے وطن سے بچھڑنے کا افسوس اور خوابوں کے وطن کے حقیقت میں بدلنے کے جوش میں شاعری نے اور زور مارا اور بہت جلد وہ بچوں کی ایسی نظمیں لکھنے لگے کہ جو رسالوں اور اخباروں میں شائع ہونے لگیں۔ جن رسالوں اور اخباروں میں محسن بھوپالی کی ابتدائی نظمیں شائع ہوئیں ان میں اسلم فرخی اور شمس تبریزی کا رسالہ ''میرا رسالہ'' روزنامہ ''جنگ'' اور پندرہ روزہ ''نمکدان'' کو خاص طور سے اہمیت حاصل ہے۔ تقریباً دو سال تک بچوں کی نظموں کا اسی طرح کے رسالوں اور اخباروں میں چھپنے کے بعد ان کی شاعری میں سنجیدگی اور پختگی آنے لگی اور ان کا کلام ملک کے معتبر ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگا۔ محسن بھوپالی کا پہلی شعری مجموعہ ''شکست شب'' ہے جو ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں جو کلام شامل ہے وہ جن رسائل وہ اخبارات میں شائع ہوا ان کے نام اس طرح ہیں۔ مشیر- کراچی، نمکدان- کراچی، بچپن، رہنما- سکھر، امروز- کراچی، نقاد- کراچی، کردار- بھوپال، دودِ چراغ محفل، کلیم- سکھر، نئی قدریں- حیدرآباد، مشرب- کراچی، شعور- حیدرآباد، افکار- کراچی، شجاع، جامِ جم، سکھر، قومی زبان- کراچی، طالب علم- کراچی، تہذیب- لاہور، سات رنگ- کراچی، راوی- بریڈفورڈ (انگلستان)

اس طرح محسن بھوپالی کی شاعری ملک کے مختلف معتبر رسائل میں چھپنی لگی اور وقفے وقفے سے ان کے شعری مجموعے بھی منظرِ عام پر آنے لگے۔ یہاں محسن بھوپالی کی شاعری کے ابتداء کی ہی تفصیل درج کی جا رہی ہے۔ ان کی کتب کی پوری تفصیل

’’محسن بھوپالی کا شعری وادبی سرمایہ‘‘ ذیلی عنوان کے تحت بیان کی جائے گی۔

صحافت و اداکاری:

محسن بھوپالی باضابطہ صحافی نہیں تھے لیکن صحافت سے ان کو گہری دلچسپی تھی اور وہ کئی رسالوں، اخباروں اور ریڈیوں سے وابستہ رہے۔ ان کی بیشتر صحافتی سرگرمیاں ادبی نوعیت کی تھیں لیکن اس سے الگ بھی انھوں نے کئی کام کیے۔ محسن بھوپالی نے صحافت میں ایم اے کرنے کا بھی منصوبہ بنایا تھا اس کے لیے انھوں نے اردو کالج، کراچی میں داخلہ لیا اور سال اول بہ حسن وخوبی کے ساتھ مکمل کیا لیکن دوسرے سال میں امتحان کے وقت انھیں کینسر کا مرض تشخص ہو چکا تھا اور اس کے مشکل معالجہ کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے اور صحافت میں ایم اے مکمل نہ کر سکے۔

محسن بھوپالی کی صحافتی سرگرمیوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ صحافت میں محسن بھوپالی کا سب سے پہلے ریڈیو حیدرآباد سے تعلق ہوا۔ محسن بھوپالی نے حسن ظہیر کے ساتھ مل کر کچھ عرصے کے لیے ایک رسالہ ’’زاویے‘‘ نکالا تھا۔ محسن بھوپالی حیدرآباد سندھ سے نکلنے والے ماہنامہ زاویہ، کی مجلس مشاورت کے ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک رکن رہے۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۰ء تک محسن بھوپالی حیدرآباد سندھ سے نکلنے والے طالب علم ڈائجسٹ سے بھی وہ وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ محسن بھوپالی دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے شعبۂ منظومات کے اگست ۱۹۹۸ء میں نگراں رہے۔ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء تک ہفت روزہ ’’الفتح‘‘ اور روزنامہ ’’جنگ‘‘ کراچی میں ایک ادبی کالم بھی لکھا۔

محسن بھوپالی جب جوان تھے انھوں نے کئی ڈراموں میں اداکاری بھی کی تھی لیکن اداکاری کو بھی انھوں نے زیادہ آگے نہیں بڑھایا ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ کے درمیان دس سال کے وقفے میں انھوں نے صرف چند ڈراموں میں اداکاری کی۔ ڈرامہ کشمکش کے ہدایت کار صمد رضوی ساز تھے اسے انھوں نے ۱۹۵۰ء میں کھیلا تھا۔ پاکستان میں بالغوں کی تعلیم کے لیے انھوں نے ایک ڈراما تعلیم بالغان خواجہ معین

الدین کی ہدایت میں ۱۹۵۶ء میں کیا۔ایک حمام میں پروفیسر محی الدین کی ہدایت میں ۱۹۵۷ء میں کیا۔اچھے مرزا نظر کامرانی کی ہدایت میں ۱۹۵۹ میں کیا اور اسی سال ارشاد علی کی ہدایت میں اندھیرے اجالے ڈرامے میں اداکاری کی۔۱۹۶۰ میں تعلیم بالغان کو خواجہ معین الدین کی ہی ہدایت میں ایک بار پھر کیا۔اس کے بعد ڈراموں میں کبھی بھی اداکاری نہیں کی۔

ادبی کانفرنسوں اور مشاعروں میں شرکت (ملکی وعالمی):

محسن کی مقبولیت ۱۹۵۴ء سے ہی ان کے مشہور قطعہ سے بہت دور دور تک پھیل گئی تھی، یہ قطعہ خاص و عام تمام حلقوں میں یکساں مقبول ہوا تھا اس لیے انھیں بہت جلد مشاعروں میں شرکت کی دعوت دور دور سے ملنے لگی لیکن ابھی بیشتر مغربی پاکستان کے ہی مشاعروں میں دعوت ملتی تھی۔ وہ ۱۹۶۲ء میں کراچی پورٹ ٹرسٹ کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے وہاں کچھ شاعروں کو ایک صاحب لفافہ دے رہے تھے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ڈھاکہ کے مشاعرے کے ہوائی ٹکٹ ہیں لیکن انھیں ٹکٹ نہیں دیا گیا۔لیکن اس مشاعرہ میں جب انھوں نے اپنا کلام سنایا تو نہایت مقبول ہوئے اور جب واپس وہ اپنی جگہ پر بیٹھے تو وہ صاحب محسن بھوپالی کو بھی مدعو کرنے آگئے۔

اس طرح وقت کے ساتھ ساتھ ان کی مقبولیت بھی بڑھتی گئی پہلے صرف مغربی پاکستان میں پھر مشرقی پاکستان میں بھی انھیں بلایا جانے لگا اس کے بعد دوسرے ممالک سے بھی انھیں بلایا جانے لگا۔محسن کو زیادہ تر تو مشاعروں میں شرکت کے لیے ہی بلایا جاتا لیکن کبھی کبھی کانفرنسوں میں بھی بلایا جاتا۔انھوں نے جن ملکوں کے لیے ادبی سفر کیے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں۔

امریکہ اور کناڈا کی بیشتر ریاستوں میں وہ گئے اور امریکا تو کئی بار گئے۔ انھوں نے امریکی سفر پر مبنی ایک سفرنامہ ''حیرتوں کی سرزمین'' کے نام سے لکھا ہے جو شائع بھی ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے یوروپ میں انگلستان اور اسکاٹ لینڈ

کا سفر کیا۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک میں انھوں نے سعودی عرب، قطر، متحدہ عرب امارات، بحرین کا سفر کیا اور جنوبی ایشیا میں ہندستان و بنگلا دیش کا سفر کیا۔

۱۹۹۵ء میں محسن بھوپالی نے حج کرنے کا شرف حاصل کیا جس کی غرض سے وہ سعودی عرب گئے حالانکہ اس سفر میں بھی ان کے اعزاز میں کئی ادبی نشستیں منعقد کی گئیں۔ ۱۹۸۸ء میں محسن بھوپالی کو کینسر کی تشخیص ہوئی جس کے آپریشن کے لیے انھوں نے، لندن (انگلستان) اور گلاسگو (اسکاٹ لینڈ) کا سفر کیا۔ ان دونوں ممالک میں بیماری کے باوجود محسن بھوپالی کے اعزاز میں ادبی نشستیں منعقد ہوئیں۔ اس کے بعد ۳۰ جون ۱۹۹۴ء میں گلاسگو (اسکاٹ لینڈ) کی بزم ادب وفن کی جانب سے شیلڈ دی گئی۔

محسن بھوپالی کا شعری وادبی سرمایہ:

محسن بھوپالی کا کل ادبی سرمایہ سترہ کتابوں اور بہت سے متفرقات مثلاً کتابوں پر تبصرے، دیباچے، پیش لفظ اور فلیپ، اخباری ورسالوں کے کالم وغیرہ پر مبنی ہے۔ جو کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔ محسن بھوپالی کی نثر کا ایک اور سرمایہ ان کی ڈائریاں ہیں، جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایک پوری الماری ان کی ڈائریوں سے بھری ہوئی ہے۔ ایک زمانے تک انھوں نے تقریباً روزانہ ہی ڈائریاں لکھی ہیں، لیکن ساری ڈائریاں غیر مطبوعہ ہیں۔ شاید تعداد میں اتنی زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ ڈائریاں شائع نہ ہوسکیں۔ ان سب کے باوجود بنیادی طور پر محسن بھوپالی شاعر ہیں۔

شعری مجموعے:

۱۔ شکستِ شب (نظموں، غزلوں اور قطعات پر مبنی) ۱۹۶۱ء
۲۔ جستہ جستہ (قطعات کا مجموعہ) ۱۹۶۹ء
۳۔ نظمانے (محسن بھوپالی کی ایجاد کردہ صنف سخن) ۱۹۷۵ء
۴۔ ماجرا (نظموں اور غزلوں پر مبنی) ۱۹۸۱ء
۵۔ گردِ مسافت (نظموں، غزلوں اور ہائیکو پر مبنی) ۱۹۸۸ء

۶۔ مجموعۂ سخن (اب تک کے تمام مجموعوں کا کلیات) ۱۹۹۲ء
۷۔ موضوعاتی نظمیں (اہم واقعات کے ردعمل میں لکھی گئی نظمیں جو کسی دوسرے مجموعے میں شامل نہیں کی گئی تھیں۔) ۱۹۹۳ء
۸۔ روشنی تو دیے کے اندر ہے ۱۹۹۶ء
(نظموں، غزلوں قطعات اور نظمانوں پر مبنی)
۹۔ شہر آشوب کراچی (گلنار آفرین کے ساتھ نظموں کا مشترکہ مجموعہ) ۱۹۹۷ء
۱۰۔ منزل (غزلوں، نظموں اور نظمانوں پر مبنی) ۲۰۰۳ء
۱۱۔ چیری سے چنبیلی تک (ہائیکو) ۲۰۰۵ء
۱۲۔ محسن بھوپالی کے سو شعر ۲۰۰۵ء

انتخاب و منظوم ترجمہ:

۱۔ جاپان کے چار عظیم شاعر ۱۹۹۷ء
۲۔ ریگزار کے پھول (سندھی سے منظوم ترجمہ) ۲۰۰۶ء

نثر:

۱۔ قومی یکجہتی میں ادب کا کردار ۱۹۸۵ء
(ادب کی بڑی شخصیات سے قومی یکجہتی پر مصاحبے)
۲۔ حیرتوں کی سرزمین (امریکا و کناڈا کا سفر نامہ) ۱۹۹۲ء
۳۔ نقدِ سخن (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۹۸ء

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ محسن بھوپالی کے ۱۲ شعری مجموعے ہیں۔ جن میں سے ایک کلیات ہے جو پرانے مجموعوں پر مبنی ہے، ایک منتخب ۱۰۰ اشعار پر مبنی ہے۔ اور ایک گلنار آفرین کے ساتھ مشترکہ مجموعہ ہے۔ اس طرح محسن بھوپالی کے کل نو ایسے شعری مجموعے ہیں جو خالص ان کے اور نئے کلام پر مبنی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سندھی

اور جاپانی شاعری سے انھوں نے انتخاب اور منظوم ترجمے کیے ہیں۔ اور ان کی تین نثری کتابیں ہیں۔ ان کی غیر مطبوعہ نثر بہت زیادہ ہے اور وہ ساری نثر شائع ہو جائے تو اس کی ضخامت شاید شاعری سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔

احتجاجی شاعری:

محسن بھوپالی بنیادی طور پر ظاہری اور خارجی حقیقت نگاری کے شاعر ہیں۔ ملک میں واقع ہو رہے تمام اہم واقعات پر ان کی گہری نظر رہتی تھی اور جب بھی کوئی ناپسندیدہ واقعہ پیش آتا تو وہ اس کا اظہار بڑی فن کاری اور دلیری کے ساتھ اپنی شاعری میں کرتے تھے۔ حق بات کہنے میں انھوں نے کبھی کسی مصلحت کا خیال نہیں رکھا۔ ترقی پسند تحریک سے ان کا ایک فطری لگاؤ تھا اس لیے ان کی شاعری میں احتجاجی عناصر فطری طور پر در آئے ہیں۔ اپنی ترقی پسندی اظہار وہ بار بار کرتے رہتے تھے۔ جنگ کے لیے سرور ساجد کو دیے گئے ایک انٹرویو میں وہ فرماتے ہیں۔

> ''میرے کلام میں تلخی دراصل میرے ذہنی رویہ کا نتیجہ ہے۔ میں ذہنی طور پر ہمیشہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہا اس لیے سیاست اور معاشرے کو دیکھنے کا ایک ترقی پسند رویہ مجھ میں موجود تھا، جس کی بنا پر تلخ حقائق میرے سامنے آئے اور شاعری میں تلخی اور مزاحمت آ گئی۔'' ۳۰

اگرچہ محسن بھوپالی باقاعدہ ترقی پسند تحریک کے رکن نہیں تھے، ترقی پسند تحریک کی بعض باتوں سے انھیں اختلاف بھی تھا مثلاً محسن بھوپالی تقسیم ہند کے وقت مسلم لیگ کے حامی تھے اور مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کے لیے جد جہد کے میں بھی شامل تھے اگرچہ اس وقت وہ بہت چھوٹے تھے اور اس وقت کے ان کے رجحان کو مجموعی طور پر ان کی فکر سے نہیں جوڑا جا سکتا لیکن بعد میں بھی انھوں نے اپنی کئی نظموں میں پاکستان کے خواب کو جائز ٹھہرایا ہے اور اس بات کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان ایک سوچی سمجھی فکر اور جدوجہد کے نتیجہ ہے جب کہ ترقی پسند عام طور مذہب کے نام پر ملک

کی تقسیم کے خلاف تھے۔اس معاملے محسن بھوپالی ترقی پسند فکر سے مختلف سوچتے ہیں۔ لیکن جہاں تک سوال عام آدمی خاص طور سے غریبوں اور مزدوروں کے حقوق کے معاملے میں وہ ترقی پسندوں کے حامی تھے۔ مذکور بالا بالا انٹرویو میں سرور ساجد کے ایک سوال کے جواب میں محسن بھوپالی نے کہا تھا۔

> ''آپ نے آدرش کے بارے میں سوال کیا ہے تو جناب اب بھی میرے آدرش میں کوئی فرق نہیں آیا میں پہلے بھی یہی سمجھتا تھا اور آج بھی یہی یقین رکھتا ہوں کہ سوویت یونین کے بکھر جانے کے بعد بھی وہی ہمارے مسائل کا حل ہے کیونکہ ہم اس زمانے میں زندہ ہیں جس کے نتیجے میں روس میں ۱۹۱۷ء میں انقلاب آیا تھا۔''[۳۱]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ محسن بھوپالی ترقی پسند تحریک سے فکری اعتبار سے وابستہ تھے اور احتجاجی شاعری اس کا ایک فطری اظہار تھا لیکن محسن بھوپال کی شاعری میں براہ راست اشتراکیت اور مزدور کسانوں کی باتیں بہت کم ملتی ہیں البتہ سیاسی رد عمل زیادہ ملتا ہے۔ محسن بھوپالی کے یہاں ترقی پسندی احتجاجی شاعری کی بڑی وجہ ضرور ہے لیکن واحد سبب نہیں ہے۔ کچھ ایسے واقعات بھی ہوئے کہ جنھوں نے انھیں احتجاجی شاعری کی طرف راغب کیا۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے جب کہ محسن بھوپالی ابھی بہ مشکل ۲۰ سال کے تھے اور شاعری ابھی ابتدائی زمانے میں تھی۔ اس وقت خواجہ شہاب الدین وزیر مہاجرین تھے انھوں نے جیکب آباد کے ایک جلسے میں کہا کہ مہاجرین کو کس نے بلایا تھا وہ ٹھیک سے یہاں رہنا ہو تو رہیں ورنہ واپس چلے جائیں۔ محسن بھوپالی کو یہ سن کر گہرا صدمہ ہوا اور اس کے ردعمل میں انھوں نے ایک نظم کہی تھی۔ جسے انھوں نے کل سندھ مہاجرین کانفرنس لاڑکانہ میں پڑھی تھی۔ اس جلسے میں تقریباً دس ہزار لوگ تھے اور نظم بہت مقبول ہوئی۔ یہ ایک ایسا جلسہ تھا جس نے ان کے دل میں مشاعروں نے جگہ بنالی۔ مشاعروں میں پڑھنے کا شوق ان کی ایک کمزوری بن گیا، مشاعروں میں وہ بہت ہی

غیر معمولی دل کش انداز میں پڑھتے تھے کہ سن نے والوں کے دل میں ایک ایک لفظ اتر تا چلا جا تا تھا۔اس نظم کے کچھ اشعار اس طرح ہیں۔

مہاجر سے خطاب

جو کہتے تھے آؤ آؤ
پاکستان کو وطن بناؤ
ہر خطرے سے خود کو بچاؤ
اب کہتے ہیں واپس جاؤ
ایسی بھی پالیسی دیکھی
نظرِ عنایت بدلی دیکھی! ۳۲؎

اس کے بعد ۱۹۵۴ء کا واقعہ ہے، واقعہ خود محسن بھوپالی کی زبانی پیش ہے۔

''وہ زمانہ بھی پاکستان کی تاریخ کا عجب زمانہ تھا۔ قائد اعظم کی وفات کے بعد تقریباً یہ طے ہو گیا تھا کہ اخبارات کی شہ سرخیاں چھپ گئی تھیں کہ اب نواب بھوپال گورنر جنرل مقرر کیے جانے والے ہیں۔ پھر خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل بنایا گیا اور چند ماہ بعد انھیں وزیر اعظم کے عہدے پر مقرر کر کے اچانک غلام محمد گورنر جنرل بن گئے تو ہم جیسے نوجوانوں کا پیمانۂ صبر چھلک پڑا اور میں نے فوری طور پر یہ شعر کہا۔ پھر کچھ عرصے بعد اس شعر کو جب قطعے کی شکل میں تبدیل کیا تو صیغۂ واحد کو جمع میں تبدیل کر دیا۔'' ۳۳؎

محسن بھوپالی نے غلام محمد کے گورنر جنرل بنائے جانے کے ردِ عمل میں احتجاجاً جو شعر پہلے کہا تھا وہ اس طرح تھا۔

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل اسے ملی جو شریک سفر نہ تھا

اس کے بعد انھوں نے اس شعر کو قطعہ کی شکل دے دی تو اس اس کی صورت یہ ہوگئی۔

تلقین اعتماد وہ فرما رہے ہیں آج
راہ طلب میں خود جو کبھی معتبر نہ تھے
نیرنگئ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے ۴۳

یہ وہ شعر (بعد میں قطعہ) تھا جس نے محسن بھوپالی کی دنیا بدل دی، اس قطعہ میں حالات پر ایسا گہرا طنز تھا کہ یہ شعر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ پیر علی محمد راشدی نے اسے پاکستان کی قومی اسمبلی میں پڑھا اور اگلے دن تمام اخباروں میں یہ سرخی میں تھا۔ خاص طور سے دوسرا شعر تو مقبولیت کی تمام حدیں پار کر گیا۔ ابھی وہ ۲۲ سال کے نوجوان تھے لیکن ان کی مقبولیت اور شہرت تمام پاکستان میں پھیل گئی۔ وہ جہاں جہاں جاتے تو اس شعر کے خالق کے طور پر انھیں بلایا جاتا۔ اردو کے ان سب سے مقبول اشعار میں اس کا شمار ہونے لگا جو بات بات میں سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ اتنی جلدی کسی شعر کو ضرب المثل بنتے ہوئے بہت کم دیکھا گیا ہے جتنی جلدی یہ شعر ضرب المثل بنا۔

تو اس طرح کے حالات پر محسن کے اشعار بہت مقبول ہونے لگے اور اس طرح ان کی شاعری کی ایک شناخت بن گئی اسے سیاسی حالات پر تبصرہ کہا جائے یا اسے احتجاجی شاعری کا نام دیں، جو بھی کہیں لیکن محسن بھوپالی کے اس نوعیت کے اشعار بہت مقبول ہوئے۔ شاید اس طرح کے حالات پر سلیقے سے شعر کہنے والوں میں ان کا نام آنے لگا۔ شاید ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ محسن بھوپالی کے یہاں احتجاجی شاعری کافی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ جو مشاعروں اور ادبی حلقوں میں بھی کامیاب رہی، اس کے ساتھ ساتھ بہت سے سیاسی وسماجی حلقوں میں بھی ان کی مقبولیت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ خاص بات یہ ہے کہ اس طرح کی شاعری کرنے میں محسن بھوپالی نے نہایت دلیری سے کام لیا۔ گورنر جنرل کے خلاف اس طرح کھل کر شعر کہنا بہت دل گردے کا

کام تھا ان کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا لیکن محسن بھوپالی نے بات کہنے میں اپنے انجام کی کوئی پرواہ نہیں کی، یہ وہ زمانہ تھا جب فیض احمد فیض ابھی جیل میں تھے اور ایک تذبذب جاری تھا انھیں چھوڑا جائے گا یا پھانسی دے دی جائے گی لیکن پھر بھی محسن بھوپالی نے ایسے اشعار کہے۔ یہ سلسلہ اور ان صفات کی شاعری محسن بھوپالی کے یہاں تقریباً پورے کلام میں ملتی ہے۔ یہ صرف نوجوانی کا جوش نہیں تھا بلکہ احتجاج محسن بھوپالی کی شخصیت کا ایک ضروری حصہ بن گیا اور ان کی تمام شاعری میں یہ رنگ ہمیشہ قائم رہا کبھی ہلکا تو کبھی گہرا۔

محسن بھوپالی کا پہلا مجموعہ ''شکست شب'' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا جس میں شروعات ۱۹۶۱ء تک کی شاعری تھی۔ اس وقت پاکستان کا بننا شکستِ شب کے استعارے کے طور پر ابھرا اور ایک بڑا طبقہ اسے شکستِ شب کے طور پر دیکھ رہا تھا لوگوں کو احساس بھی ہو رہا تھا اور لگ رہا تھا کہ صبح کی کرن آچکی ہے اور بس نور پھوٹنے والا ہے۔ اگرچہ فیض احمد فیض جیسے دور بیں نے اسی وقت اسے داغ داغ اجالا ہی کہا تھا۔ ۱۹۸۸ء میں جب گرد مسافت شائع ہوا تو وہ شکست شب کا احساس کافی عرصے پہلے جا چکا تھا اور جنھیں پہلے شکستِ شب کا احساس تھا انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ اس مسافت کا حاصل صرف گرد ہی گرد ہے۔ تو اس طرح محسن کی شاعری میں پوری قوم کی پچاس سالہ تاریخ نظر آتی ہے، اس کے زیر و بم کسی نہ کسی طور پر نظر آتے ہیں اور احتجاج ان کی شاعری کے مرکز میں ہے۔ یہ تاریخ کبھی استعاروں اور علامتوں میں چھپی ہوئی تو کبھی براہ راست حقیقت کو عیاں کرنے والی۔

اعترافِ خدمات، اعزازات و انعامات:

محسن بھوپالی نے یوں تو سفرنامہ، تنقید، تبصرے، انٹرویو، وغیرہ نثری کی مختلف اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی بنیادی شناخت ایک شاعر کی ہے۔ اور دنیا انھیں بنیادی طور پر شاعر کی حیثیت سے ہی جانتی ہے۔ ان کی شاعری کے اعتراف

میں انھیں دنیا کے کئی حصوں میں ادبی انعمات و اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ لیکن انھوں نے مشاعروں میں جو مقبولیت حاصل کی وہ بہت کم شعرا کے حصے میں آتی ہے اور مشاعروں میں حاصل داد و تحسین زندگی کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہے۔ یہاں دھیان رکھنے کی بات یہ کہ وہ آج کل کے مشاعروں کے شاعر نہیں ہیں، جن کی شاعری کا جادو بس مشاعروں میں چلتا ہے کیونکہ مشاعروں میں ان کا ترنم، ان کی ادا کاری اور وضاحتی بیانات کی وجہ سے ان کی شاعری کا جادو چلتا ہے لیکن جب ان کی شاعری رسالوں میں چھپتی ہے تو وہ شاعری بہت پھس پھسی ثابت ہوتی ہے۔ محسن بھوپالی کی تمام شاعری مشاعروں میں مقبولیت پانے کے ساتھ ساتھ رسالوں اور کتابوں بھی شائع ہوتی رہی اور وہاں بھی ان کا اسی طرح سے اعتراف کیا گیا۔ انھیں جن اعزازات سے نوازا گیا ہے ان میں چند حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امریکا کے لاس اینجلس، کیلی فورنیا میں پاکستان امریکا ایسوسیشن کی جانب سے ایوارڈ، ۸ دسمبر ۱۹۹۰ء

۲۔ ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر تقریب جشن محسن دی لابی کراچی نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ۱۲۷ کتوبر ۱۹۹۲ء

۳۔ لندن کے محمد علی جناع ہاؤس میں جشن محسن اور ادبی انعام سے نوازا گیا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۹۴ء

۴۔ اسکاٹ لینڈ، گلاسگو کی بزم ادب وفن کی جانب سے شیلڈ، ۷ جون ۱۹۹۴ء

۵۔ شام ہمدرد، کراچی کی جانب سے وثیقہ اعترافِ خدمات۔ ۱ نومبر ۱۹۹۴ء

۶۔ بھوپال لورز انٹرنیشنل فورم کی جانب سے نشانِ سپاس، ۱۳ جولائی ۱۹۹۶ء

۷۔ بزم اردو، نیویارک کی جانب سے جشن محسن اور شیلڈ۔ ۴ جنوری ۱۹۹۷ء

ان کے چاہنے والوں نے محسن بھوپالی کو بہت نوازا لیکن حکومت کی طرف سے ان کی کوئی خاص پذیرائی نہیں ہوئی جس کی انھوں نے کبھی شکایت بھی نہیں کی۔ کیونکہ سیاست میں جب جب کوئی ناپسندیدہ واقعہ ہوا تو انھوں نے حکومت کے خلاف کوئی شعر کوئی قطعہ

کہنے میں کبھی بھی کوتاہی نہیں کی۔انھوں نے اس کے انجام یا اقتدار کے ناراض ہونے کے ڈر سے اپنی زبان کبھی بند نہیں کی۔

تحقیقی مقالے:

محسن بھوپالی پر ایک تحقیقی مقالہ محترمہ نزہت انیس نے ''محسن بھوپالی شخصیت اور فن'' کے نام سے لکھا ہے جو جامعہ کراچی میں ایم اے کی سند کے لیے لکھا گیا۔ یہ مقالہ ڈاکٹر مہ جبین زیدی کی زیرِ نگرانی ۱۹۹۸ء میں لکھا گیا اور فرید پبلشرز اینڈ بک سیلرز، اردو بازار کراچی سے ۲۰۰۲ میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے تحقیقی مقالے کی کوئی خبر نہیں ملتی۔ اس کے بعد اب راقم برکت اللہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر عتیق النساء کی نگرانی میں ڈاکٹر آف فلاسفی کے لیے یہ مقالہ لکھ رہی ہے۔ اس کے علاوہ محسن بھوپالی پر کئی رسالوں کے خصوصی گوشہ بھی نکالے جا چکے ہیں۔ جن کی ایک فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔	چہارسو، راول پنڈی	اکتوبر ۱۹۹۳ء
۲۔	روز نامہ کلیم، سکھر	۲۷ ستمبر ۱۹۹۸
۳۔	سہ ماہی ہانگوانٹرنیشنل، کراچی	جولائی تا ستمبر ۱۹۹۹ء
۴۔	ماہنامہ سپوتنک، لاہور،	اکتوبر ۲۰۰۰
۵۔	ماہنامہ بیاض، لاہور،	مئی ۲۰۰۱
۶۔	مجلّہ معاصر، لاہور	۲۰۰۲
۷۔	سہ ماہی کہکشاں، کراچی،	جنوری تا مارچ ۲۰۰۴
۸۔	سہ ماہی انشاء، حیدر آباد،	اپریل تا دسمبر ۲۰۰۷

اس طرح سے ان کے بارے میں کافی کچھ لکھا جا چکا ہے اور ان کے زمانے کے تقریباً تمام بڑے سے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے لکھا یا اظہار خیال کیا ہے۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی سے لے کر شمس الرحمٰن فاروقی تک بے شمار اکابرین

ادب نے ان کچھ نہ کچھ اظہار خیال کیا ہے۔ کچھ تحریریں تو ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں اور بہت سی تحریریں ان مقالوں اور رسالوں کے خصوصی گوشوں میں یکجا کر دی گئی ہیں۔

طویل علالت:

محسن بھوپالی زندگی کے زندگی میں ۱۹۸۷ء/۱۹۸۸ء کے سال بہت مشکل سال تھے جب وہ گلے کے کینسر میں مبتلا ہوئے۔ اس بارے میں محسن بھوپالی خود بتاتے ہیں۔

''جون ۱۹۸۷ء کی بات ہے کہ میرا حلق بے حد خشک رہنے لگا اور آواز بیٹھنے لگی۔ اس وقت بڑے بڑے سرجنوں نے گلے کی تکلیف کی تشخیص کی مگر بعد میں biopsy سے پتا چلا کہ لیرنگز میں جس جگہ آواز بنتی ہے۔ کینسر ہو چکا ہے۔ جام شورو سینٹر میں ریڈیو تھیراپی ہوئی جو صرف چھ ماہ تک کامیاب رہی اور پھر دوبارہ آواز بیٹھنے لگی تو ڈاکٹرز نے رائے دی کہ اب آپریشن کروانا پڑے گا اور یہ آپریشن لندن یا گلاسگو میں ہو تو اچھا ہے۔''[۳۴]

اس وقت محسن بھوپالی کی مالی حالت ٹھیک نہ تھی، بہت سی انجمنوں اور شاعروں نے اکادمی ادبیات سے تعاون کی اپیل کی، اس وقت وزیر اعظم محمد جونیجو تھے انھوں نے بھی مدد کی ہدایت دی۔ اکادمی کے چیئرمین پریشان خٹک اور ڈائرکٹر جنرل غلام ربانی نے ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا لیکن ان سب سے کل دو ہزار پونڈ جمع ہو سکے جب کہ پانچ ہزار پونڈ درکار تھے۔ اس موقعے پر محسن بھوپالی کے لڑکپن کے دوست علی حسن نے اپنے دوست آغا مسعود حسین سے بات کی انھوں نے ناظم جیوا صاحب سے بات کی انھوں نے لندن آنے پر دو ہزار پونڈ دینے کا وعدہ کیا کیونکہ آپریشن کے لیے انھیں لندن سے ہو کر ہی گلاسگو جانا تھا۔ ناظم جیوا صاحب نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ باقی رقم کو انھوں نے اپنے ذاتی وسائل سے جمع کیا اور گلاسگو آپیریشن کروانے پہنچ گئے وہاں

ڈاکٹر شفیع کوثر منہ بولی بھتیجی راجو سے بہت گھریلو مراسم ہو گئے ان لوگوں کی وجہ سے سارے کام بہ حسن وخوبی پائے۔ سرجن شبیر حیدر زیدی نے آپریشن سے قبل ایک بات کہی تھی جس سے انھیں بہت حوصلہ ملا اور یہ بات بہت بعد تک انھیں حوصلہ دیتی رہی۔ وہ جملہ تھا۔''اگر زندگی کو بچانے کے لیے ایک عضو دینا پڑے تو دے دینا چاہیے۔''۳۵؎

بہر حال محسن بھوپالی اپنی ہمت اور حوصلے سے کینسر جیسے مہلک مرض سے لڑ کر اور جیت کر واپس گھر آ گئے لیکن ان کی وہ آواز واپس نہ سکی جس آواز کو سننے کے لیے مشاعروں میں ہزاروں آدمی بے چین رہتے تھے۔ محسن بھوپالی شعر ترنم سے تو نہ پڑھتے تھے لیکن تحت میں ہی ان کے پڑھنے کا انداز بہت شاندار تھا۔ ان کی پاٹ دار آواز میں گھن گرج رہتی تھی۔ اور اب وہ آواز ہی نہ تھی لیکن بہر حال ایک آلۂ صوت کے ذریعے انھوں نے بولنے پر قابو پا لیا۔ اور ایک بار پھر مشاعروں کی دنیا میں وہ واپس آ گئے۔ اس سلسلے میں سرور ساجد لکھتے ہیں۔

> ''آج کل بھی مشاعروں میں ایک نئی آواز کے ساتھ شعر سناتے ہیں۔ وہ اپنے ترمیم شدہ آلۂ صوت کو انگشتِ شہادت کی مدد سے استعمال کرتے ہیں۔ یہ گویا محسن صاحب کی عمر ثانیہ ہے جس میں ان کی آواز کی طبعی شکل بدل گئی ہے۔ اور ان کا لہجہ اور طرز دوستی و دشمنی بھی۔ زندگی اور موت کے درمیان رہنے کے تجربے اور نئی زندگی حاصل کرنے کے تجربے کے بعد ان کی شاعری میں نرمی اور رومانیت کا عنصر در آیا ہے۔''۳۶؎

اس آپریشن کے بعد وہ تقریباً انیس سال حیات رہے جس دوران انھوں نے اپنے ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ اس وقت تک ان کی صرف چھ کتابیں شائع ہوئی تھیں، جن میں سے پانچ شعری مجموعے تھے اور ایک قومی یکجہتی پر مشاہیر کے انٹرویو پر مبنی تھی۔ آپریشن کے بعد کے ۱۹ برسوں میں ان کی ۹ کتابیں اور بہت سے دیگر مضامین شائع ہوئے۔ آپریشن کے بعد بھی وہ کئی امراض سے لڑتے رہے۔

انتقال:

محسن بھوپالی نے بیماریوں سے لڑتے ہوئے لیکن معمولات زندگی سے ایک خوشگوار رویہ رکھتے ہوئے تقریباً انیس سال گزارے۔ جسم کی تمام مشکلوں خاص طور بولنے کے تکلیف کی باوجود انھوں نے ادبی سرگرمیوں میں کمی نہیں آنے دی خواہ مشاعروں میں شرکت ہو یا کتابوں کی اشاعت۔ بلکہ ان سرگرمیوں میں اور تیزی ہی آ گئی تھی۔ لیکن انسان کچھ بھی کر لے زندگی کا انجام موت ہی ہوتا ہے۔ ان انیس برسوں میں جسم کی جدو جہد جاری رہی اور آخر کار ۱۶ جنوری ۲۰۰۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس سلسلے میں حسن ظہیر نے لکھا ہے۔

> محسن بھوپالی کی خبر اچانک نہیں ملی تھی، ان کی زیست کے کھو جانے کا سا دھڑکا لگا ہی رہتا تھا۔ وہ ایک عرصہ سے زندگی کی جنگ نہایت حوصلے کے ساتھ لڑ رہے تھے اور یہ حوصلہ ان کا مزاج بن گیا تھا، لیکن موت ۱۶ جنوری ۲۰۰۷ء کی ایک ساعت میں ان کی زندگی پر قابو پانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔'' ۳۷

اس طرح سے ظاہر ہے کہ محسن بھوپالی نے ایک طویل عرصے تک موت سے بڑے حوصلے کے ساتھ جدو جہد کی لیکن موت تو لاحق ہے۔ تھوڑے وقت کے لیے اس کو بس بہلایا جا سکتا ہے اس سے جیت کوئی نہیں سکتا۔ ان کی موت سے تمام اردو دنیا میں ماتم کی لہر دوڑ گئی اور ہر کسی نے ان کی موت پر اظہار افسوس کیا۔

خراجِ عقیدت:

محسن بھوپالی کے انتقال کے بعد رسالہ انشاء نے اپنا اپریل تا دسمبر کا شمارہ محسن بھوپالی اور ڈاکٹر الیاس عشقی کی نذر کیا تھا۔ جس میں دونوں شخصیات کو خراج عقیدت پیش کی گئی ہے۔ محسن بھوپالی کو منظوم خراج عقیدت مختار کریمی، جمال نقوی اور حسن ظہیر جعفری نے پیش کی ہے۔ جب کہ نثر میں جو مضامین خراجِ عقیدت کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ ان

میں خالد یوسف کا مضمون محسن ''بھوپالی اور الیاس عشقی'' دونوں شخصیات پر ہے۔ جمال نقوی کا مضمون ''محسن کی شخصیت اور فن کے رنگ'' محسن بھوپالی پر ہے۔اس کے علاوہ سید تحسین گیلانی کا مضمون ''محسن بھوپالی کی یاد میں'' اور شفیق الرحمٰن الہ آبادی کا مضمون ''محسن بھوپالی کی یاد میں'' ہے اور حسن ظہیر جعفری کا مضمون ''محسن چلے گئے'' بھی اس شمارے میں شامل ہیں۔سب نے محسن بھوپالی کے اعلیٰ کردار، اعلیٰ اخلاق اور شاعری کی فن وفکر کی تعریف کی ہے۔اس کے علاوہ اس شمارے میں دو ایسے مضامین بھی ہیں جو بنیادی طور پر محسن بھوپالی کے ایک شعری مجموعے پر مبنی ہیں لیکن وہ بھی ایک طرح سے ان کو خراجِ عقیدت کے طور پر ہی پیش کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں مضامین ہیں-سلطان جمیل نسیم کا مضمون ''روشنی تو دیے کے اندر ہے'' اور ڈاکٹر حسرت کا سگنجوی کا مضمون ''چیری سے چنبیلی تک'' ان کے شعری مجموعوں پر لکھے ہیں لیکن ان میں محسن بھوپالی کو یاد کرتے ہوئے ایک طرح سے خراج عقیدت ہی پیش کی گئی ہے۔اس کے علاوہ محسن بھوپالی کا ایک حمد اور چھ قطعات کی شکل میں ان کی شاعری کے چند نمونے بھی اس میں شامل ہے۔اس شمارے میں محسن کے شعری مجموعہ ''چیری سے چنبیلی تک'' کتاب پر جمال نقوی نے تبصرہ بھی کیا ہے۔

محسن بھوپالی کو جو منظوم خراجِ عقیدت پیش کی گئی وہ نظمیں حسب ذیل ہیں۔

مختار کریمی

محسن کارواں

(محسن بھوپالی مرحوم کی نذر)

آخرِ شب کے رہ رو تجھے کیا کہوں
برق رفتار تھا گرم گفتار تھا
تیرے قدموں کے نیچے زمیں سخت تھی
تیرے سر پر فلک بھی شرر بار تھا
تو مگر بائیں رستے پہ چلتا رہا

راہ میں گو عقارب کی یلغار تھی
عزم کا اسمِ اعظم تجھے یاد تھا
سارے خطرات رستے سے مٹتے گئے
خار پھولوں سے سانچوں میں ڈھلتے گئے
تجھ کو عہدِ رواں سے یہ شکوہ رہا
جو شریکِ سفر بھی نہ تھے
منزلیں پا گئے
پھر بھی تو رہِ خار پر
آبلہ پائی کو آزماتا رہا
درد اور کرب میں مسکراتا رہا
لوگ کہتے ہیں تو تھک گیا، گر گیا
میں یہ کہتا ہوں تو گر کے بھی اٹھ گیا
نور کے ایک مینار میں ڈھل گیا
محسن کارواں بن گیا ۳۸

جمال نقوی

محسن بھوپالی کے لیے ہائیکو کا نذرانہ

ہائیکو کے محسن
سونی سونی لگتی ہے
محفل تیرے بن
واکا ہائیکو
دونوں اچھے لگتے ہیں
محسن بھائی کو

محسن بھوپالی
جن کے بن یہ ہائیک کی
محفل ہے خالی ۹۳ء

حسن ظہیر جعفری

پرسہ
(محسن بھوپالی کی یاد میں)

آہ میں کس طرح بھولوں تو بتا
کس طرح یادِ گزشتہ کے دریچوں کے میں بند کروں
اب تو آنکھوں کی بصارت بھی نہیں ساتھ میرے
کیسے ایک نوحہ تیری یاد میں لکھ دوں محسن
وہ ایک پرسہ جسے رسم کہیں گر میں نبھانے بھی گیا
گھر کے ایک کمرے میں میرے دوست کی تصویر بھی آویزاں تھی
وہی تصویر ہے جو دل میں میرے اب بھی ہے
میرے محسن میرے ہر وقت کے ساتھی محسن
اب کوئی فون تمہارا میرے نام نہیں
اب کوئی خط بھی تمہارا میرے نام نہیں
میرے محسن میر ہر وقت کے ساتھی محسن
آہ میں کس طرح بھولوں تو بتا

(کینیڈا اور امریکہ سے آنے کے بعد پہلی نظم) ۰۸ء

پہلی نظم میں محسن کے سماجی، سیاسی اور ادبی خدمات خاص طور سے قیامِ پاکستان کو ایک کارواں کے طور پر دیکھا گیا ہے جس پر محسن بھوپالی کے احسانات کو عقیدت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں محسن کی موت کو کسی یاسیت کے طور پر نہ دیکھ کر

بلکہ ان کی خدمات کو یاد کرتے ہوئے ایک عزم کے طور پر دیکھا گیا ہے۔

دوسری نظم ''محسن بھوپالی کے لیے ہائیکو نظرانہ'' میں محسن بھوپالی کا اردو کی دو اصناف ہائیکو اور دوا کا میں جو خدمات ہیں ان کا اعتراف کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ محسن بھوپالی کے بغیر دونوں اصناف اب سونی سونی سی لگتی ہیں۔

تیسری نظم حسن ظہیر جعفری کی پرسہ (محسن بھوپالی کی یاد میں) ہے حسن ظہیر محسن بھوپالی کے دیرینہ دوست تھے اور ایک عرصے سے کینیڈا اور امریکہ میں مقیم تھے آخری وقت میں ان سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ انتقال کے بعد انھوں نے جو پہلی نظم لکھی وہ یہی تھی۔ یہ نظم ایک ذاتی مرثیہ کی شکل اختیار کر لی ہے جس میں مرنے والے شخص کی خوبیوں، اس سے دیرینہ تعلقات اور ذاتی یادوں وغیرہ ایک پرسوز طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت وفن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۷

۲۔ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت وفن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۸

۳۔ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت وفن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۵

۴۔ محسن بھوپالی، منزل، کینوس کمیونکیشن، فیز v، DHA-کراچی ص ۱۱۹

۵۔ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت وفن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۵

۶۔ محسن بھوپالی، بحوالہ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت وفن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۳۰ اور ۱۳۱

۷۔ محسن بھوپالی، بحوالہ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت وفن'، فرید پبلشرز اینڈ بک

سیلز، اردو بازار، کراچی،۲۰۰۲ء،ص 131

۸۔ محسن بھوپالی، بحوالہ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت وفن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، اردو بازار، کراچی،۲۰۰۲ء،ص 131

۹۔ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت وفن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۲ء،ص ۱۰

۱۰۔ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت وفن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، اردو بازار، کراچی،۲۰۰۲ء،ص ۱۰

۱۱۔ محسن بھوپالی، نسیم نقوی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں، نوائے وقت، ۱۹ نومبر ۱۹۹۲ء

۱۲۔ محسن بھوپالی، جنگ کے نمائندے سرور ساجد، ۲۳ دسمبر ۱۹۹۴ء، کراچی

۱۳۔ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت وفن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، اردو بازار، کراچی،۲۰۰۲ء،ص ۹،۱۰

۱۴۔ محسن بھوپالی، روزنامہ جنگ، ۲۳ ستمبر ۱۹۹۴ء

۱۵۔ محسن بھوپالی، لمحۂ فکریہ، موضوعاتی نظمیں، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۹۳، ص ۱۹ و ۲۰

۱۶۔ محسن بھوپالی، مجموعۂ سخن رگردِ مسافت، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۸، ص ۵۳۰/۵۳۱

۱۷۔ اسلم فرخی، محسن...... شخص وفن، ماہنامہ بیاض، مئی 2001، لاہور

۱۸۔ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت وفن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۲ء،ص ۶

۱۹۔ سلطان جمیل نسیم، محسن بھوپالی (شکست شب سے مجموعے سخن تک) سہ ماہی، کہکشاں، جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ ص ۱۰۲

۲۰۔ محسن بھوپالی، ہفت روزہ معیار، کراچی کے لیے گل زیب زیبا کو دیے گئے ایک انٹرویو۔

۲۱۔ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت وفن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، کراچی،۲۰۰۲ء،ص ۲۶

۲۲۔ محسن بھوپالی، ہفت روزہ معیار، کراچی کے لیے گل زیب زیبا کو دیے گئے ایک انٹرویو۔

۲۳۔ محسن بھوپالی، نسیم نقوی کو دیے انٹرویو میں، نوائے وقت، ۱۹ نومبر ۱۹۹۲ء

۲۳۔ سلطان جمیل نسیم، محسن بھوپالی (شکستِ شب سے مجموعہ سخن تک)، ماہنامہ اسپوتنک، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۰، ص ۸۸
۲۴۔ اسلم فرخی: محسن...... شخص و فن، ماہنامہ بیاض، لاہور مئی ۲۰۰۱ء ص ۴۴
۲۵۔ حسن ظہیر جعفری، نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت و فن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۶
۲۶۔ نسیم نقوی، 'نوائے وقت' ۱۹ نومبر ۱۹۹۲ء
۲۷۔ محسن بھوپالی، نسیم نقوی کو دیے انٹرویو میں، نوائے وقت، ۱۹ نومبر ۱۹۹۲ء
۲۸۔ محسن بھوپالی، نسیم نقوی کو دیے انٹرویو میں، نوائے وقت، ۱۹ نومبر ۱۹۹۲ء
۲۹۔ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت و فن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، کراچی، ۲۰۰۲، ص ۲۹
۳۰۔ محسن بھوپالی، سرور ساجد کو دیے گئے انٹرویو میں، ۲۳ دسمبر ۱۹۹۴ء
۳۱۔ محسن بھوپالی، سرور ساجد کو دیے گئے انٹرویو میں، ۲۳ دسمبر ۱۹۹۴ء
۳۲۔ محسن بھوپالی، موضوعاتی نظمیں، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۳ء ص: ۵۷
۳۳۔ محسن بھوپالی، شکست شب، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۸۹، ص ۱۰
۳۴۔ محسن بھوپالی، بحوالہ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت و فن'، فرید پبلشرز اینڈ بک، سیلز، کراچی، ۲۰۰۲، ص ۱۸
۳۵۔ شبیر حیدر زیدی، بحوالہ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت و فن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، کراچی، ۲۰۰۲، ص ۱۹
۳۶۔ سرور ساجد، جنگ، کراچی ۲۳ دسمبر ۱۹۹۴ء
۳۷۔ حسن ظہیر جعفری، محسن چلے گئے، انشاء، حیدرآباد، اپریل تا دسمبر ۲۰۰۷، ص ۱۲۴
۳۸۔ مختار کریمی، محسنِ کارواں (محسن بھوپالی مرحوم کی نذر) انشاء، حیدرآباد، اپریل تا دسمبر ۲۰۰۷ ص ۶۵
۳۹۔ جمال نقوی، محسن بھوپالی کے لیے ہائیک کا نذرانہ، انشاء حیدرآباد، اپریل تا دسمبر ۲۰۰۷ ص ۶۷
۴۰۔ حسن ظہیر جعفری، پرسہ، انشاء حیدرآباد، اپریل تا دسمبر ۲۰۰۷ ص ۶۸

محسن بھوپالی کی شعری خدمات

(۱) نظم وقطعہ نگاری

(۲) غزل گوئی

(۳) نظمانے (نظم وافسانے کے امتزاج کی حاصل ایک نئی صنف)

(۴) ہائیکو

(۵) منظوم تراجم (جاپانی اور سندھی شعراء کے کلام کا منظوم ترجمہ وانتخاب)

(۱) نظم وقطعہ نگاری

محسن بھوپالی بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں، اگر چہ ان کی نثر بھی اہم ہے، لیکن شاعر اظہار خیال کی پہلی اور فطری پسند ہے۔ شاعری میں ان کو قدرت حاصل ہے اس لیے وہ موضوع اور طبیعت کے مطابق مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک طرف روایتی اصناف مثلاً غزل، قطعہ اور نظم میں طبع آزمائی کی ہے، وہیں وہ ایک نئی صنف نظمانے کے موجد ہیں۔ ساتھ ہی ہائکو میں بھی انھوں نے نمایاں نام کیا ہے بلکہ اردو میں ہائکو کی صنف وقار بخشنے والے اولین شعرا میں محسن بھوپالی کا نام سر فہرست ہے۔

نظمیں محسن بھوپالی کی شاعری کا ایک اہم حصہ ہیں۔ جو ان کے کئی شعری مجموعوں میں شامل ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں: شکست شب (۱۹۶۱ء)، ماجرا (۱۹۸۱ء)، گرد مسافت (۱۹۸۸ء) موضوعاتی نظمیں (۱۹۹۳ء) روشنی تو دیے کے اندر ہے (۱۹۹۶) شہر آشوب کراچی (۱۹۹۷ء) منزل (۲۰۰۳ء)۔ اس طرح سے محسن بھوپالی کے سات شعری مجموعوں میں نظمیں شامل ہیں اور انھوں نے شاعری کا آغاز بھی نظموں سے ہی کیا تھا۔ نظمیں کچھ ذاتی طبیعت میں بھی شامل تھیں اور کچھ اس وقت بھی پر آشوب تھا اور ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا ان وجوہات کی بنا پر محسن بھوپالی کے یہاں نظموں کو کافی اہمیت حاصل ہے انھیں محسن بھوپالی کی ضمنی اصناف میں شامل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

محسن بھوپالی نے ۱۹۴۷ سے شاعری کا آغاز کیا اور ۱۹۴۸ سے ان کا کلام مختلف رسالوں میں شائع ہونے لگا تھا۔ لیکن ان کے پہلے شعری مجموعے ''شکست شب'' میں ۱۹۵۱ء سے قبل کا کوئی کلام نہیں ملتا ہے۔ اس وقت تک کا بیشتر کلام بچوں کی نظمیں تھیں شاید اسی لیے ایک عرصے تک اس دور کی شاعری کو کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں کیا گیا۔ جس سے ۱۹۵۱ء تک کے ان کے کلام اور فکر و رجحان کا کچھ پتا نہیں چلتا۔

یہ نظمیں بہت بعد میں ان کے مجموعہ ''موضوعاتی نظمیں''(۱۹۹۳) میں شامل کی گئیں۔ اس مجموعے کی نظموں کے بارے میں محسن بھوپالی خود لکھتے ہیں۔

''یہ نظمیں اس سے پہلے میرے کسی مجموعے میں شریک نہیں ہیں۔ ان کی اشاعت ہر بار اس خیال سے موخر ہوتی رہی کہ ان میں سے بیشتر کا تاثر میرے نزدیک لمحاتی یا واقعاتی تھا۔ جب پچھلے دنوں میں نے ان پر دوبارہ نظر ڈالی تو عجیب طرح کی سرخوشی محسوس کی۔ ذہن کے پردے پر ان کی وجہ تخلیق اپنے پورے پس منظر کے ساتھ نمایاں ہوتی چلی گئی۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد کا ماحول، جنگ ستمبر، سقوطِ ڈھاکہ اور دیگر اہم قومی موڑ متحرک فلم کی طرح نظروں کے سامنے آگئے جیسے کل کی بات ہو۔''[1]

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ پہلے شاعر کے ذہن میں ان نظموں کی حیثیت محض لمحاتی یا واقعاتی تھی لیکن ایک طویل عرصے کے بعد یہ بات کھلی کہ ان لمحوں یا واقعات کی حیثیت محض وقتی نہ تھی بلکہ وہ سب اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور لوگوں کے ذہنوں سے وہ واقعے یا لمحے ابھی تک محو نہیں ہوئے ہیں۔ اس لیے ان نظموں کی ابھی بھی اہمیت ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد کا ماحول ہو جنگ ستمبر کا ماحول یا سقوط ڈھاکہ یہ سب واقعے نہ صرف تاریخ وتہذیب میں درج ہو چکا ہے۔ بلکہ ہمارے ذہنوں میں ابھی بھی بسے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں محسن بھوپالی کی ایک نظم ''نغمہ'' پیش ہے جو بچوں کے لیے ہے اور ۱۹۴۹ء میں لکھی گئی تھی۔

نغمہ

شجاعت کے پرچم اڑاتے چلو
ترانے مسرت کے گاتے چلو
تم اعدا کو نیچا دکھاتے چلو
زمانے پہ سکہ جماتے چلو
قدم جوش سے تم بڑھاتے چلو

شجاعت کے پرچم اڑاتے چلو

سکھاؤ زمانے کو درسِ اخوت
بڑھاؤ تم آپس میں رسمِ محبت
اندھیرے میں تم لے کے شمعِ ہدایت
دکھا دو بھٹکوں کو راہِ صداقت
انھیں حکم قرآں سناتے چلو
شجاعت کے پرچم اڑاتے چلو

جو ہو عزمِ راسخ نہیں کچھ بھی مشکل
وہ دیکھو وہ دیکھو نظر آئی منزل
جماؤ یہاں پاک نغموں کی محفل
ہوں سینوں میں اپنے مروت بھرا دل
قدم تم بھی محسن بڑھاتے چلو

شجاعت کے پرچم اڑاتے چلو[۲]

یہ نظم ایک ایسے نوجوان کی ہے جو ابھی محض ۱۷سال کا ہے وہ اور ایک ایسی قوم سے مخاطب ہے جس کو ایک نئی قوم کی شناخت محض دو سال قبل ملی ہے۔ اس میں جوانی کی امنگیں موجود ہیں، بہتر مستقبل کی خواہشیں ہیں، راہ راست پر چلنے کی ہدایت ہے دوسروں کو ساتھ لے کر چلنے کا ارادہ ہے اور سب سے اہم سخت محنت کی تلقین ہے۔ ہم اس زمانے کے محسن بھوپالی سے انھیں سب چیزوں کی توقع کر سکتے ہیں۔ ۱۷سال کے نوجوان سے فکر کی گہرائی کی توقع کرنا بے معنی ہوگا۔ اسی طرح کی ایک نظم ''لمحۂ فکریہ'' ہے۔ اس میں بہر حال نغمہ سے زیادہ گہرائی ہے لیکن پھر بھی جذبات وہی ہیں۔

لمحۂ فکریہ

یومِ آزادیِ پاک ہے دوستو!
آج تزئین ہر بام و ایواں کرو

ذرہ ذرہ تجلی سے معمور ہو
قریے قریے کو رشکِ گلستاں کرو
خار و خس ہوں حریف گلاب و سمن
اس طرح اہتمام بہاراں کرو!
آج ہر موڑ پر مشعلیں نصب ہوں
کوچے کوچے میں جشن چراغاں کرو
ہاں مگر ایسے رنگین لمحات میں
یاد کر لو انھیں بھی جو تم میں نہیں
وہ جواں عزم پیر و زن و طفل و مرد
جن کے شوق شہادت پہ لاکھ آفریں
آج تک ناز کرتی ہے جن پر زمیں
وہ ستارے جو مٹی میں روپوش ہیں
ہے وطن جن کے پرتو سے مہر مبیں
راہ دے کر من و تو کے احساس کو
ان کے ایثار پر حرف آنے نہ دو
رنگ اور نسل کا تذکرہ چھیڑ کر
ان کے جذبوں کو بیکار جانے نہ دو
خطۂ پاک سے ہے تمھارا وجود
خطۂ پاک پر آنچ آنے نہ دو [۳]

محسن بھوپالی کی اس زمانے کی بیشتر نظموں میں وطن سے محبت سے سرشار جذبات ملتے ہیں جن میں اس وطن کو سجانے سنوارنے کی باتیں اور جشن منانے کی باتیں ہیں جو وطن محنت اور جد و جہد سے ملا ہے۔ اس زمانے کی دیگر تخلیقات میں حمد، نعت، میرا اسکول، کلرک کا شکوہ، خطۂ گلاب، نغمۂ وطن، رجز، غازیان پاک، سرزمین

وطن، نغمۂ پاکستان وغیرہ اہم نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں وطن سے محبت، اس کی تعمیر، شہیدوں کو خراج عقیدت وغیرہ موضوعات پر نظمیں ہیں۔ اور اس وقت پاکستان کے مسلم نوجوانوں کی امنگوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔

کچھ وقت بعد کی ایک دلچسپ اور اہم نظم 'زمانۂ الیکشن' ہے، یہ نظم بھی ایک موضوعاتی نظم ہے جو پاکستان میں الیکشن کے موقعے پر لکھی گئی تھی۔ اس نظم کے بارے میں بھی محسن بھوپالی کا یہی خیال تھا کہ لحاتی نظم ہے۔ لیکن یہ نظم بھی دلچسپ ہے نظم کچھ اس طرح ہے۔

زمانۂ الیکشن

اک ممبرن بھی اپنی سہیلی کے ساتھ تھیں
یعنی مجسٹریٹ کی بیوی کے ساتھ تھیں
آپا شمیم اپنی بڑی بی کے ساتھ تھیں
اختر بھی اپنی ساتھ کی کھیلی کے ساتھ تھیں
ان سب کے حق میں وجہ ملاقات ہو گیا
ووٹنگ کا دن بھی یوم مساوات ہو گیا۔[۲۴]

اس نظم میں مزاح کا پہلو بہت نمایاں ہے، بعد میں محسن بھوپالی کے یہاں یہ لہجہ اور نکھرتا ہے جو طنز میں بدل جاتا ہے اور محسن بھوپالی کی شاعری کی نمایاں شناخت بنتا ہے۔ اس زمانے کی اس نوعیت کی دوسری نظمیں ہجرت نامہ، کلرک کا شکوہ، وغیرہ اہم ہیں۔

اس سلسلے کی ایک نظم ''میرا اسکول'' بہت اہم ہے۔ یہ نظم بھی ابتدائی زمانے کی ہے۔ اس کی ادبی حیثیت بھی بہت زیادہ نہ سہی۔ اسکولی بچوں کے لیے یہ بہت اہم نظم ہے اور ان کے نصاب میں شامل کرنے لائق ہے ہر بچے کو پڑھنی چاہیے۔

میرا اسکول

مجھے اپنا اسکول ہے دل سے پیارا
اسی نے مری زندگی کو سنوارا

میں اس سے ہمیشہ محبت کروں گا
میں اس کی دل و جاں سے خدمت کروں گا
نہ کیوں مجھ کو اسکول سے ہو محبت
اسی نے دکھائی ہے راہ صداقت
سنا ہے بزرگوں سے یہ قول اکثر
کہ تعلیم انسان کا ہے اصل زیور
خدایا مجھے اتنی ہمت عطا کر
کہ پھیلاؤں علم و ہنر کو میں گھر گھر [۵]

لیکن اسی زمانے میں واقع ہوئے ایک واقعے سے تلخی بھی نظر آتی ہے۔ اسے محسن بھوپالی نے موضوعاتی نظموں کے پیش لفظ میں خود رقم کرتے ہیں۔

''اس زمانے میں خواجہ شہاب الدین وزیرِ مہاجرین تھے انھوں نے جیکب آباد کے میں ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''مہاجرین کو کس نے بلایا تھا وہ ٹھیک طرح سے یہاں رہیں ورنہ واپس چلے جائیں۔'' اس اعلان کا ذکر میں نے حذف کیے جانے والے بند میں اس طرح کیا تھا۔''

جو کہتے تھے آؤ آؤ
پاکستان کو وطن بناؤ
ہر خطرے سے خود کو بچاؤ
اب کہتے ہیں واپس جاؤ
ایسی بھی پالیسی دیکھی
نظرِ عنایت بدلی دیکھی!

''مہاجر سے خطاب'' (صفحہ ۵۷) میرے لیے اس وجہ سے یادگار حیثیت کی حامل ہے کہ میں نے یہ نظم کل سندھ مہاجرین کانفرنس

لاڑکانا منعقدہ ۷ امئی ۱۹۵۲ء کے پلیٹ فارم پر تقریباً دس ہزار افراد
کے مجمع میں پڑھی تھی۔ اتنے بڑے اجتماع میں نظم سنانے کا میرے
لیے یہ پہلا موقع تھا۔''۷

محسن بھوپالی کا پہلا شعری مجموعہ شکست شب ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں ان کی ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک کی شاعری موجود ہے جس میں نظمیں، غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔ اس مجموعے میں ۲۴ نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں غزلیں اور قطعات ہیں۔ محسن بھوپالی کا شہرۂ آفاق قطعہ بھی اسی مجموعے میں ہے۔

تلقین اعتماد وہ فرما رہیں آج
راہ طلب میں خود جو کبھی معتبر نہ تھے
نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے ۷

اس مجموعے کے پیش لفظ میں محسن بھوپالی شاعری کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں انفرادی جذبات اور داخلی احساسات کے بجائے مجھے خارجی حقیقتوں اور ان کی ہیئتی تبدیلیوں سے زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ اسی لیے میری بیشتر تخلیقات اجتماعی زندگی اور اس کے گوناگوں متحرک عوامل کا مظہر ہیں۔ ماحول کے دلآویز و رنگین پردوں میں چھپی ہوئی تلخ حقیقتوں کا اظہار میرا مسلک رہا ہے اور پستی کی وادیوں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو سہارا دینا میرا نظریۂ فن۔ تاکہ جدید معاشرہ ''کیا ہے'' اور ''کیا ہونا چاہیے'' کے بارے میں سوچ سکے، سمجھ سکے اور عمل کر سکے اور آج کے سائنسی دور کا یہی تقاضا ہے۔''۸

محسن بھوپالی کے اس بیان سے واضح ہے کہ وہ کسی حد تک ترقی پسند تحریک سے

اس حد تک متاثر تھے کہ شاعری کو زندگی کا ترجمان مانتے تھے، شاعری کے ذریعے زندگی میں اصلاح کے حامی بھی تھے۔ کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے کے درمیان کی خلا کو پر کرنے کے لیے شاعری کو ذریعہ بنانا چاہتے تھے اور معاشرے کی اصلاح کے خواہاں تھے۔ انھوں نے جنگ کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔

> ''میرے کلام میں تلخی دراصل میرے ذہنی رویے کا نتیجہ ہے۔ میں ذہنی طور پر ہمیشہ ترقی پسندی سے وابستہ رہا اس لیے سیاست اور معاشرے کو دیکھنے کا ایک ترقی پسندانہ رویہ مجھ میں موجود تھا جس کی وجہ سے تلخ حقائق میرے سامنے آئے اور شاعری میں تلخی اور مزاحمت آ گئی۔''

محسن بھوپالی اس انٹرویو میں صاف صاف قبول کرتے ہیں کہ ذہنی طور پر وہ ہمیشہ سے ترقی پسندی سے وابستہ رہے ہیں اور اس کے ثبوت کے طور پر اپنی شاعری میں تلخ حقائق اور مزاحمت کی موجودگی کی بات کرتے ہیں۔ لیکن حقائق کی تلخی اور مزاحمت کسی بھی فکر سے وابستہ شاعر کے یہاں ہوسکتی ہے یہ چیزیں صرف ترقی پسندی سے وابستہ نہیں ہیں۔ ترقی پسند کے لیے لازمی ہے کہ اگر وہ اشتراکیت میں نہ بھی یقین رکھتا ہو تو بھی کم از کم سماجی مساوات، غریب اور مزدور کے انصاف کی بات تو لازمی ہے۔ وہ ترقی پسندی کے باضابطہ رکن نہیں تھے لیکن ان کی شاعری میں سیاسی بے داری بہت زیادہ ہے، خاص طور سے حکومت سے ناراضگی اور تلخی ان کے کلام میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ اس لے انھیں مکمل ترقی پسند کہنا ذرا مشکل ہے لیکن ان کو ترقی پسندی سے خارج بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان کی ترقی پسندی کے بارے میں سلطان جمیل نسیم لکھتے ہیں۔

> ''محسن ترقی پسند تھے اور ہیں لیکن وہ ترقی پسندی کو مارکسزم اور اشتراکیت کے ساتھ نتھی نہیں کرتے، ذہنی اپج، اظہار اور اسلوب کا نیاپن، خیال کی تازگی کو اور اخلاق اور شائستگی کو وہ ترقی پسندی سمجھتے

ہیں۔ان کے ذہن کی کھڑکیاں چاروں طرف کھلتی ہیں۔"۹

سلطان جمیل نسیم نے محسن بھوپالی کی ترقی پسندی کا بہت صحیح تجزیہ کیا ہے کہ وہ مارکسزم اوراشتراکیت کے مکمل ماننے والے نہیں ہے لیکن باقی چیزوں میں وہ ترقی پسند ہیں۔ترقی پسند فلسفۂ حیات سے ان کا کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔اس سے قبل کہ محسن بھوپالی کے پہلے شعری مجموعے کی فکر ونظر پر مزید بات کی جائے بہتر ہوگا کہ ان کی چند نظموں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔اس مجموعے کی پہلی نظم ہے۔ میناباز ار۔

میناباز ار

کون کہتا ہے کہ ہم نظم کہن بھول گئے
عرصۂ حال میں ماضیٔ وطن بھول گئے
دورِ جمہور میں شاہوں کا چلن بھول گئے
اپنے اجداد کی عظمت کا تماشہ دیکھو
آؤ مرتی ہوئی تہذیب کا لاشہ دیکھو!۱۰

اس نظم میں شاعر کشمکش کے دور سے گزر رہا ہے۔ایک طرح وہ نئے نظام کا خواہاں بھی ہے وہ اس دور جمہور میں موجود شاہوں کے چلن سے نالاں بھی ہے تو دوسری طرف مرتی ہوئی تہذیب کے لاشہ کو دیکھ کر مغموم بھی ہے۔

مصنف کی نظر میں اس مجموعے کی سب سے اہم نظم شاید ہے"شکست شب" ہے۔شاید اسی لیے مجموعے کا نام بھی اسی نظم کے نام پر رکھا گیا ہے۔وہ نظم اس طرح ہے۔

شکستِ شب

مہیب رات کا عالم یہ پھیلتے سائے
کوئی تو بڑھ کے ردائے سیاہ الٹائے
کسی طرح تو فسونِ شبِ الم ٹوٹے
کوئی تو مہرِ جہاں تاب کی خبر لائے

یہ عرصہ گاہِ ہلاکت یہ دور تیرہ شبی
یہ کس مقام پہ لے آئی اپنی سادہ دلی
چہار سو یہ اندھیرا یہ تہہ بہ تہہ ظلمت
چراغ راہ گزر ہے کہیں نہ شمع کوئی

یہ اہتمام یہ آئیں کہ کوئی لب نہ ہلے
سلے تو کس طرح دامانِ چاک چاک سلے
کمالِ شوق ہے یا انتہائے محرومی
حیات ڈھونڈنے نکلیں تو اذاں دار ملے

عبث ہے شب کے دلاروں سے اقتضائے سحر
نہ دیگی کچھ بھی ہمیں پیروی گرد سفر
ملے تو منزلِ مقصود کے طرح سے ملے
ہر ایک بھٹکا ہوا راہ رو بنا رہبر!

جواں نہیں جو عزائم تو کوششیں بے فیض
دلوں میں سوز نہیں ہے تو مشعلیں بے فیض
جواں امنگیں یقیں سے جو ہوں نہ ہم آہنگ
تو رفعتیں بھی ہیں بے سود منزلیں بے فیض

ہمیں یقین ہے کہ یہ تیرہ بختی انساں
تراش لے گی خود اپنے لیے مہ تاباں

تغیرات کی زد میں ازل سے ہے دنیا
جو کل تھا آج نہیں ہے جواب ہے کل وہ کہاں

حیاتِ نو کا تقاضا یہی ہے ہم نہ رکیں
صدائیں آتی رہیں دم بہ دم قدم نہ رکیں
ذرا سی لغزشِ بے جا ہے علم وفن کا زوال
زباں پہ بندشیں لگ جائیں پر قلم نہ رکیں!!

یہ نظم کئی سطحوں پر قابل ستائش ہے۔اس نظم کی سب سی بڑی خوبی جو پہلی ہی نظر میں اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے وہ رات کا استعارہ جسے اس نظم میں بہت خوبی کے ساتھ نبھایا گیا ہے۔ہم سب جانتے ہیں کہ شب کا استعارہ ظلمتوں یعنی جبر والم کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

محسن بھوپالی اپنی نظم ''جاتے جاتے''میں نوآبادیاتی نظام سے خطاب کرتے ہیں۔اور ملک کی موجودہ حالت کے لیے اسے قصوروار مانتے ہیں۔

جاتے جاتے

(یوم آزادی پر اہلِ مغرب سے خطاب)

قدم قدم متزلزل نظر نظر ہے اداس
کچھ اس طرح سے سکون وقرار دے کے گئے
ترس رہی ہیں نگاہیں تبسم گل کو
چمن کو خوب فریب بہار دے کے گئے

گلوں کا رنگ چمن کا شباب چھین لیا
بنام امن وسکوں بے کلی بڑھا کے گئے

پلائی خوب مئے اقتدار جاتے ہوئے
خودی تو دے نہ سکے بیخودی بڑھا کے گئے

کچھ اس طرح سے نوید بہار دے کے گئے
فروغ آتشِ گل سے چمن سلگ اٹھا
لبوں پہ آنے بھی پائے نہ تھے خوشی کے راگ
زبان خشک ہوئی اور دہن سلگ اٹھے

کمال فہم سے کھینچا ہوا ادھورا خط
تمھارے حسن تدبیر کا دے رہا ہے سراغ
ہے اب بھی جنت ارضی پہ قبضۂ شداد
دلوں میں آج بھی روشن ہیں نفرتوں کے چراغ

ہماری فکر میں گھلتے ہو کیوں ریا کارو
ہم اپنے بگڑے مقدر کو خود بنائیں گے
ہم اپنے خون سے سینچیں گے گلستان وطن
ہماری بزم ہے ہم اس کو خود سجائیں گے[۱۲]

یہ نظم ۱۹۵۶ء کی ہے اس وقت آزادی کے نو سال گزر چکے تھے، خود محسن بھوپالی اب چوبیس سال کے ہو چکے تھے اور فکر کا ایک ٹھہراؤ سا نظر آنے لگا ہے، بات میں گہرائی بھی نظر آنے لگی تھی۔ اس نظم میں عہد حاضر کی بدحالی اور اداسی کا منظر بھی ہے، اس بدحالی کا سبب بھی واضح ہے، تاریخ کا ایک نقشہ بھی ہے اور مستقبل کے لیے عزم بھی ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی نقشہ اس میں نہیں ہے لیکن ہر نظم ایسا ہو ضروری بھی نہیں ہے۔ یہاں شاعری کا ان کا اپنا ایک اسلوب بھی ابھر کر سامنے آرہا ہے۔ ان کا مزاحیہ

لہجہ اب واضح طور پر طنز میں تبدیل ہوتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔

شکستِ شب کے بعد ''ماجرا'' محسن بھوپالی کا دوسرا ایسا شعری مجموعہ ہے جس میں نظمیں شامل ہیں جو ۱۹۸۱ء میں یعنی پہلے شعر مجموعے کے تقریباً بیس سال بعد شائع ہوا۔ اس دوران ان کے دو شعری مجموعے اور بھی شائع ہوئے، ''جستہ جستہ'' محض قطعات شامل تھے اور ''نظمانے'' میں ایک نئی صنف ''نظمانے'' ہی تھے دیگر اصناف کی نگارشات ان دونوں میں نہ تھیں۔ ماجرا میں صرف غزلیں اور نظمیں ہیں۔ ماجرا مجموعے میں صرف ۱۴ نظمیں شامل ہیں۔ جس میں سے تین نظمیں نذرالاسلام، کرشن چندر اور مخدوم محی الدین کی یاد میں لکھی گئی ہیں۔ ان تینوں شاعروں وادیبوں کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دوران ان کا ترقی پسندی سے رشتہ اور بھی استوار ہوا ہے۔ اس مجموعے کی پہلی نظم ہوا بے مہر اس طرح ہے۔

ہوا بے مہر

ہوا تلملاتی ہے
اور حرف پتوں پہ آتا ہے
یہ چڑچڑے ہیں

ہوا چیختی ہے
اور الزام شاخوں پہ آتا ہے
باہم الجھنے کی آدی ہیں یہ

ہوا اپنی نرم انگلیوں سے اگر گدگدائے
یہی شاخیں جھومیں
یہی پتے دھیمے سروں میں
نئی دھن سنائیں!

نئے گیت گائیں!!۱۳

اس نظم اور پہلے کی نظموں جو پہلی نظر میں فرق نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے مجموعے کی ساری نظمیں پابند تھیں جب کہ اس مجموعے کی بیشتر نظمیں آزاد نظمیں ہیں۔ پہلے مجموعے کی بیشتر نظمیں براہ راست تھیں کچھ میں استعارہ نظر بھی آتا ہے جیسے کہ شکست شب میں لیکن اس میں شب کا استعارہ بہت مانوس تھا جسے بے شمار شاعروں نے اس سے قبل بھی اسی معنی میں استعمال کیا ہوا تھا اگر چہ محسن بھوپالی کی نظم میں شب کے استعارے کا تناظر بالکل الگ تھا یہی اس کی خوبی تھی لیکن اس نظم ہوا بے مہر میں استعارہ سازی کا عمل بالکل ذاتی ہے۔ یہ وہ استعارہ نہیں ہے جو ہزار بار برتا گیا ہو در اصل تخلیق کا کمال یہی ہے۔ اس نظم میں زندگی میں تناسب کی بات کی گئی ہے۔ نامناسب چیزوں کی تخریب کافی نہیں ہوتی ہے جب تک اس میں تعمیر کا پہلو نہ ہو یہ نظم نئی دھنوں اور نئے گیتو کی تعمیر کی بھی بات کرتی ہے۔ محسن بھوپالی کی یہ نظم ان کی بہترین تخلیقات میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ ان کی ایک نظم ''دوراندیشی'' جو ان کے تعارف کے سلسلے میں اکثر گفتگو میں رہی ہے۔ وہ بھی اسی مجموعے میں ہے۔

دوراندیشی

تم محسن ہو؟
یہ تو ٹھیک ہے
لیکن تم یہ بھوپالی کیوں لکھتے ہو
اگر نہ لکھتا آپ پوچھتے
کہاں کے رہنے والے ہو؟
میں کہتا لاڑکانے کا
تم پھر کہتے پاکستان آنے سے پہلے
کون سے شہر میں رہتے تھے؟
میں کہتا بھوپال

............گھما پھرا کر مجھ کو جو بتلانا پڑتا

میں نے ساتھ ہی لکھ رکھا ہے! [۱۴]

یہ نظم ان کے تعارف کے سلسلے میں تو اہم ہے ہی لیکن اس نظم کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو بار بار پاکستان سے نہ صرف اپنی محبت بلکہ اس کی تعمیر اس کے مستقبل کے لیے ہر طرح سے کوشاں اور اس نے اس سلسلے میں کئی نظمیں بھی کہی ہیں۔ اس مجموعے میں بھی ایک نظم "ارض پاک" شامل ہے۔ ایسے شخص کو بار بار یاد دلایا جاتا ہے کہ تم مہاجر ہو؟ اور پاکستان سے اس کی وفاؤں پر بار بار سوال اٹھائے جاتے ہیں تو لگتا ہے اس سے جھنجلا کر اس نے یہ نظم کہی ہے۔ پاک کے تئیں وہ کتنا فکر مند ہیں ان کی نظم ارض پاک ملاحظہ ہو۔

ارض پاک

ہزاروں پھول سے چہرے جھلس کے خاک ہوئے

بھری بہار میں اس طرح اپنا باغ جلا

ملی نہیں ہمیں ارضِ پاک تحفے میں

جو لاکھوں دیپ بجھے ہیں تو یہ چراغ جلا [۱۵]

محسن بھوپالی کے اگلے شعری مجموعے گرد مسافت (۱۹۸۸ء) میں نظمیں، غزلیں اور ہائیکو ہیں۔ اس مجموعے میں کل نو نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں فکر اور فن دونوں اعتبار سے ایک ٹھہراؤ ہے یعنی جو خوبصورتی پچھلے مجموعے کی نظموں میں تھی وہ یہاں بھی برقرار ہے۔ ان نظموں کے خالق کو نظم کی ہیئت، شعری محاسن، استعارہ سازی، فکر کی گہرائی تمام عناصر پر دسترس حاصل ہے۔ کم لفظوں میں مقصد کو پالینا تمام خوبیاں جو ایک اچھے شاعر میں پائی جاتی ان نظموں ہیں موجود ہیں۔

تسلسل ٹوٹ جائے گا

نہ چھیڑو کھلتی کلیوں، ہنستے پھولوں کو

ان اڑتی تتلیوں، آوارہ بھنوروں کو

تسلسل ٹوٹ جائے گا

فضا محوِ سماعت ہے،
حسیں ہونٹوں کو نغمہ ریز رہنے دو
نگاہیں نیچی رکھو اور مجسم گوش بن جاؤ
اگر جنبش لبوں کو دی
تسلسل ٹوٹ جائے گا

وہ خوابیدہ ہے خوابیدہ ہی رہنے دو
نہ جانے خواب میں کن وادیوں کی سیر کرتی ہو
بلندی سے پھسلتے آبشاروں میں کہیں گم ہو
فلک آثار چوٹی پر کہیں محوِ ترنم ہو
اگر آواز دی تم نے
تسلسل ٹوٹ جائے گا

میں شاعر ہوں،
مری فکرِ رسا، احساس کی اس سطح پر ہے
جس میں خوشبو رنگ بنتی ہے
صدا کو شکل ملتی ہے
تصور بول اٹھتا ہے
خموشی گنگناتی ہے
یہ وہ وقفہ ہے............ ایسے میں
اگر دادِ سخن بھی دی

تسلسل ٹوٹ جائے گا[۶۶]

محسن بھوپالی کی دو اور نظموں ملاحظہ فرمایئے۔

گیس المیہ کے بعد

شہر بھوپال............اے ارضِ دار السلام!
ایک مدت کے بعد آج پھر تجھ سے ہوں ہم کلام
سالہا سال کے فاصلے کاٹ کر
اپنے یاروں میں ہوں......اپنے پیاروں میں ہوں
شہر بھوپال اے ارضِ دار السلام!
جس تباہی سے گزرے
ترے بچے بوڑھے......ترے مرد و زن
اس کی تشبیہ تاریخ انسانیت میں نہیں
اس کے معنی کسی بھی لغت میں نہیں
......فکر انساں رسا ہے تو بس اس قدر
کچھ کہا، کچھ سنا ہے تو بس اس قدر
روزِ محشر سے پہلے قیامت کی شب آئی تھی
لے کے ہمراہ طوفانِ غیظ و غضب آئی تھی
ساتھ اپنے ہزاروں دھڑکتے دلوں کی صدا لے گئی
دعاؤں کو اٹھے ہوئے سارے دستِ دعا لے گئی
شہر بھوپال............اے ارضِ دار السلام![۶۷]

یہ نظم بھوپال گیس کے المیہ سے متاثر ہو کر کہی گئی ایک بہت پر اثر نظم ہے۔ بھوپال گیس المیہ ایک ایسا المیہ ہے کہ جس کی مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ کوئی نظم اس کی شدت اور اس کے تادیر اثر کو بیان نہیں کر سکتی۔ ہر بار اس کے بارے میں کچھ پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تشنگی نہیں بجھی شاید یہ احساس محسن بھوپالی کو

بھی تھا اسی لیے وہ کہتے ہیں اس کی تشبیہ تاریخ انسانیت میں نہیں اور اس کے معنی لغت میں نہیں۔ نہ اس درد کو شعر میں یا تشبیہ میں ڈھال کر بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے لغت کے ذریعے سمجھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس نظم کے ابتدائی مصرعے بھی بہت اہم ہیں۔ ایک مدت کے بعد پھر تجھ سے ہوں ہم کلام، سالہا سال کے فاصلے کاٹ کر اپنے یاروں میں ہوں اپنے پیاروں میں ہوں۔ میں ہجرت کا سارا درد سمٹ آیا ہے۔ یہ عجیب سی کسک ہوتی ہے کہ آپ کسی چیز کو شعوری طور پر چھوڑ کر جاتے ہیں دل و دماغ سے نئے حالات کو قبول کر لیتے ہیں، مطمئن بھی ہیں۔ لیکن دل میں اس پرانی چیز کی اک بے نام ٹیس سی ابھرتی رہتی ہے، ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے۔ جو اس درد کو محسوس نہیں کر سکتا اسے یہ درد سمجھایا بھی نہیں جا سکتا۔ وہ یہی کہتا رہے گا کہ جب آپنے ایک چیز کو خود چھوڑا ہے تو اب اسے کیوں یاد کرتے ہو؟ اسی مجموعے میں ایک نظم ''ورثہ'' ہے جسے پڑھ کر لگتا ہی نہیں ہے کہ گیس المیہ کے بعد لکھنے والا شاعر ورثہ بھی لکھ سکتا ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں ''بوجھل سر سے ماضی کے احسان جھٹک کر اٹھو'' پوری نظم اس طرح ہے۔

ورثہ

آخر کس امید پہ اپنا سر نہوڑائے
بوڑھے پیڑ کے نیچے بیٹھے
بیتے لمحے گنتے رہو گے
بوجھل سر سے ماضی کے احسان جھٹک کر اٹھو
دیکھو یہ سب کوڑھ کی ماری شاخیں
گل کر گرنے والی ہیں
اس موٹے بے ڈول تنے کے غار میں جھانکو
ویرانے اپنے بال بکھیرے...... خشک زباں سے،
اک اک جڑ کو چاٹ رہی ہے

آؤ کوڑھ کی ماری شاخوں کے گلنے سے پہلے
اک پودا ہی دیتے جائیں [۱۸]

گردِ مسافت کے بعد محسن بھوپالی کا جو شعری مجموعہ شائع ہوا وہ ان کا کلیات تھا جو مجموعۂ سخن کے نام سے شائع ہوا اس میں اب تک کے شائع شدہ تمام مجموعوں کا کلام شامل تھا۔ اس میں چونکہ کوئی نیا کلام نہیں تھا اور اس سے پہلے کے کلام پر ہم پہلے سے گفتگو کر چکے ہیں۔ اس لیے اس مجموعۂ سخن کے بارے میں الگ سے گفتگو کرنے کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔ اس کے بعد محسن بھوپالی کا جو شعری مجموعہ شائع ہوا وہ ''موضوعاتی نظمیں'' ہے جو ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے پر کچھ گفتگو اسی باب کے شروع میں ہو چکی ہے لیکن اس میں انھیں نظموں کا ذکر تھا جو ان کی ابتدائی دور کی نظمیں تھیں لیکن اس میں کچھ اور واقعاتی یا لمحاتی نظمیں بھی ہیں جو تقریباً چالیس سال کے عرصے میں لکھی گئیں۔ یہاں ان نظموں کے بارے میں گفتگو کرنی ہوگی۔ اس مجموعے کی ایک نظم 'دو وطن' میں شعری احساسات زیادہ نمایاں ہیں۔ اسے پڑھ کر لگتا ہے نہیں ہے کہ یہ کسی واقعاتی یا لمحاتی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ یہ نظم ایک ایسے انسان کے جذبات کو نمایاں کرتی ہے جو ہجرت کر کے آیا ہے جسے اپنے ماضی پر ناز بھی ہے اور جذباتی لگاؤ بھی ہے لیکن اس کے ذہن میں مستقبل کا نقشہ بھی ہے جسے اسے نئے ملک میں تعمیر کرنا ہے۔

میرے آباؤ اجداد کا وہ وطن
جو کہ ورثے میں مجھ کو ملا وہ وطن
وہ وطن جس کے اک شہر میں
ہنستا بستا ہوا ایک گھر
عظمتِ رفتہ کے نقش اپنے دیوار و در پر سجائے ہوئے
اپنے ماضی پہ نازاں مکینوں پہ سایہ کناں تھا

....

یہ وطن میرے جذبات کا آئنہ دار ہے
حاصل جہد وایثار ہے
یہ وطن، یہ زمیں، ہے مری دوسری ماں
اس کے قدموں میں میں نے،
بتادی ہے اک عمر
اس آرزوں میں...... کہ جو ساعتیں بچ رہی ہیں
اسی کی دمکتی ہوئی خاک کی نذر ہوں
میرا پیکر ہواور اس کی آغوش ہو
میرا پیکر ہواور اس کی آغوش ہو۳۳

یہ نظم دو حصوں میں ہے پہلے حصے میں اپنے پرانے وطن جو کہ اس کے آباواجداد کا تھا اسے ورثے میں ملا تھا، اسی وطن کے ایک شہر کے ایک گھر میں وہ ہنسی خوشی سے زندگی بسر کر رہا تھا، جس میں پرانی عظمتوں کی نشانیاں بھی تھیں، اس سے در و دیوار روشن تھے۔ وہ مکان اپنے تمام مکینوں کو سایہ فراہم کرتا تھا۔ جب کہ دوسرے حصے میں جب کہ وہ نئے وطن میں آ گیا ہے تو وہ کہتا ہے۔ یہ وطن میرا جذبات کا آئنہ دار ہے، وہ وطن تو مجھے ورثے میں ملا تھا لیکن یہ وطن جد و جہد اور قربانیوں سے ملا ہے۔ یہ وطن میری دوسری ماں کی طرح ہے، اب اسی کے قدموں میں مجھے اپنی زندگی گزارنی ہے۔ اپنے پیکر کو اس کی آغوش میں کھو دینا چاہتا ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ نظم کا پہلا حصہ پابند نظم (نظم معریٰ) میں کہا گیا ہے۔ جب کہ دوسرا حصہ آزاد نظم ہے جب ایک بسے بسائے وطن کی بات کر رہا ہے تو پابند نظم میں بات کی گئی ہے اور جب ایک نئے وطن کی بات کی گئی ہے جس میں ابھی سب کچھ نیا تعمیر کرنا ہے اسے آزاد نظم میں نظم کہا گیا ہے۔ اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے، کہ جب نئی فکر، نیا نظام اور نیا ادب آتا ہے تو اپنے ساتھ نئی ہیئت اور نیا اسلوب بھی لاتا ہے۔

موضوعاتی نظمیں کے بعد محسن بھوپالی کا اگلا شعری مجموعہ 'منظر پتلی میں' تھا جو خالص ہائیکو پر مبنی تھا۔ اس کے بعد اگلا شعری مجموعہ ''روشنی تو دیے کے اندر ہے'' شائع ہوا تو اس میں بس ایک نظم ''ہمارا جرم'' تھی۔

ہمارا جرم

ہمارا جرم اتنا ہے
ہمارا رائے اپنی ہے
ہمارا ذہن اپنا ہے
ہمارا جرم اتنا ہے

وہ ہم سے چاہتے ہیں
کمیّوں اور ہاریوں کی طرح ہم بھی
پاؤں چومیں، ہاتھ جوڑیں
اور ہٹ کر دور جا بیٹھیں
مگر یہ کس طرح ممکن ہے
جو جمہوریت کی راہ میں
سب کچھ لٹا کر آئے ہیں
وہ آمروں جاگیرداروں
اور سرداروں کی ہر خواہش کے آگے سر کو خم کر دیں
مگر یہ عین ممکن ہے،
کہ اپنے رائے اپنے ذہن کے نیلام سے پہلے
ہم اپنی داستاں پھر سے صلیبوں پر رقم کر دیں

ہم اس قائد کے پیرو ہیں

وہ قائد جس نے اپنے قول کو
اپنے عمل میں ڈھال کر ثابت کیا
وہ راہ حق پر تھا
وہ جس نے خواب کو زندہ حقیقت میں بدل ڈالا
وہ قائد! ہاں وہی قائد
جو اپنا ذہن رکھتا تھا
جو اپنی رائے رکھتا تھا
اسی قائد کے پیرو ہیں
ہمارا جرم اتنا ہے
ہماری رائے اپنی
ہمارا ذہن اپنا ہے
ہمارا جرم اتنا ہے ۱۹

یہ نظم پچھلے دو مجموعوں کی عام روش سے ہٹ کر ہے، اس میں براہ راست بیان ہے، تلخی اور طنز بہت شدید ہے۔ یہ سوال ہر باضمیر انسان کی زندگی میں آتے ہیں، کہ وہ اپنے ضمیر کی سنے یا مال و زر کے لیے، اقتدار کے لیے، اہل اقتدار کے آگے سر کو جھکائے، پاؤں چومے اور ہاتھ جوڑے۔

روشنی تو دیے کے اندر ہے کہ بعد محسن بھوپالی کا شعری مجموعہ شہر آشوب کراچی شائع ہوا یہ مجموعہ کلی طور پر محسن بھوپالی کا نہیں بلکہ گلنار آفرین کے ساتھ مشترکہ مجموعہ تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ مخصوص حالات پر مبنی نظموں، غزلوں، قطعات اور خطوط پر مبنی ہے۔ اس مجموعے کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے ثاقب محسن نے عرضِ ناشر میں لکھا ہے۔

"شہر آشوبِ کراچی" پیش خدمت ہے۔ ۲۹ جنوری ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۶ء کے اواخر تک کے طویل عرصے میں "آپریشن کلین اپ"

اور ''پولس مقابلے'' کے نام پر حیدرآباد سندھ اور بالخصوص کراچی
کی مینڈٹ رکھنے والی اکثریتی آبادی پر جو روح فرسا مظالم
ڈھائے گئے اور ان علاقوں کے باشندے قتل و غارت گری کے
جس ہولناک دور سے گزرے اس کا تذکرہ اخبارات اور اہلِ
سیاست کے بیان میں تو ہوتا ہی رہا لیکن ان واقعات اور سانحات
کا اثر اہلِ قلم نے بھی قبول کیا۔......زیرِ نظر کتاب میں ہم نے ان
مجموعوں میں شامل کلام کے انتخاب کے علاوہ ان کا المیۂ کراچی
سے متعلق بعد میں شائع ہونے والا کلام بھی اشاعت کے ساتھ
شریک کیا ہے۔......علاوہ ازیں کتاب کے آخر میں محسن بھوپالی
اور گلنار آفریں کے ادبی خطوط کو بھی شامل کیا گیا ہے۔''[۲۰]

اس مجموعے میں کئی نظمیں ایسی ہیں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ مثلاً سب سے پہلے وہ قطعہ ہے ''منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے'' جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ''دور اندیشی'' اور ہمارج جرم نظمیں ہیں جن کا بھی اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد تصویر، مقابلہ، نئی سحر، خود فریبی اور دو منظر نظمیں ہیں۔ دو نظمیں ملاحظہ ہوں۔

تصویر

خبر کے ساتھ اک تصویر ہے
اور اس کے نیچے لکھا ہے:
یہ دونوں
(ہتھکڑی پہنے ہوئے لڑکے)
مسلح اہلکاروں کے مقابل تھے
جنہیں مقبول کہہ کر تم دہائی دے رہو
وہ تو قاتل تھے![۲۱]

اور اس کے اگلے صفحہ پر دوسری نظم ''......مقابلہ'' ہے

......مقابلہ

ہم نے تم کو چھوڑ دیا ہے،
بھاگو بھاگو...... بھاگو
تڑتڑتڑتڑتڑتڑ!۲۲

آخری نظم ''دو منظر'' ہے۔

دو منظر

کھلے میدان میں
باپ بیٹے
مصلے پر اُدھر
ماں ہے بہن ہے۲۳

ان نظموں سے بہت صاف واضح ہے کہ ایک کھلا ظلم و جبر ہو رہا ہے لوگ پریشان ہیں، پولس اور فوج کھلے عام لوگوں کا قتل کر رہی ہے لیکن ان کی آواز سننے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ سب نظمیں ایک پر آشوب زمانے کی ہیں اس لیے ان کی ہیئت، شعری محاسن اور اسلوب تلاش کرنا بہت زیادہ معنی خیز نہیں ہے۔ یہ نظمیں ایک صورت حال کو بیان کرنا چاہتی ہیں جس میں یہ کامیاب ہیں ایسی نظموں کے لیے زبان پر قابو اور استعارہ سازی میں مہارت سے زیادہ سچ کہنے کی ہمت کی تقاضا کرتی ہیں۔ جو یہ نظمیں کر رہی ہیں۔

''منزل''، محسن بھوپالی کا وہ آخری مجموعہ ہے جس میں نظمیں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں کل سات نظمیں ہیں۔ جن میں سے ایک نظم ''ہم جنگ نہ ہونے دیں گے'' ہندستان کے سابق وزیر اعظم اٹل وہاری واجپائی کی ہے۔ محسن بھوپالی نے اپنی نظم ''ہم جنگ نہ ہونے دیں گے'' اسی کے جواب میں لکھی ہے۔ متن میں اٹل وہاری واجپائی کی اصل نظم اور اس کا جواب میں محسن بھوپالی کی نظم دونوں دی گئی ہیں۔ اس کے بعد اس مجموعے میں پانچ نظمیں ''درخت کا قتل''،

بانجھ، دعا گو، انتباہ، اور زود پشیماں شامل ہیں باقی سب غزلیں اور نظمانے ہیں۔ یہ پانچوں نظمیں الگ الگ موضوعات یا واقعات پر ردعمل ہیں۔ ان نظموں میں وہ گہرائی و تہداری نہیں ہے جو مثلاً ماجرا اور گرد مسافت وغیرہ میں تھی۔ مثلاً ایک نظم ''زود پشیماں'' پیش ہے۔

زود پشیماں

ترقی پسندوں نے
جب یہ کہا تھا
کہ سرمایہ داری ہے
انسانیت کے لیے ایک لعنت
تو فتوے ملے تھے کہ کافر ہیں یہ!
اور جب اس ہزاریے کے آغاز میں
''عالمی نظم نو'' کے تحت سام نے
اپنے ڈالر کے زیر اثر کر کے
سب قوتوں کو یہ باور کرایا ہے
اپنی زمیں گاؤں کی مثل ہے
(جس میں ہر ملک ایک کھیت ہے)
اور میں گاؤں کا چوہدری ہوں
مرے منہ سے نکلا ہوا لفظ آئین ہے
صرف لبیک سننے کا عادی ہوں میں
تو وہی مفتیان اجل آج قائل ہوئے
ان کے ہونٹوں پہ بھی نوحۂ حال ہے
اب چچا سام ان کی نظر میں بھی
فطنہ طراز و ستمگار و دجال ہے! [۴۴]

اس نظم میں صاف صاف لفظوں میں سرمایہ داری اور امریکی جبر کی تنقید کی گئی ہے اور ان مولویوں کی بھی تنقید کی گئی ہے جو ایک زمانے میں ترقی پسندوں کو کافر کہا کرتے تھے اور امریکہ کی حمایت کرتے تھے۔ آج جب امریکہ کا سخت اور اصلی چہرہ ان کے سامنے آ چکا ہے تو وہی لوگ جو کل امریکہ کی حمایت کر رہے تھے انھیں فطنہ و دجال تک کہہ رہے ہیں لیکن اب اس زود پشیماں سے کیا فائدہ؟ نظم ''انتباہ–امریکہ افغان جنگ کے پس منظر میں'' بھی اسی نوعیت کی نظم ہے جس میں امریکہ کو افغانستان پر حملہ کرنے سے انتباہ کیا گیا ہے۔ اور جس طرح امریکہ افغانیوں پر ظلم کر رہا ہے اس کو انتباہ کیا گیا ہے کہ وقت ایک دن اس کے اس عمل کا انتقام لے گا۔ ''درخت کا قتل'' اس مجموعے کی ایک خوبصورت نظم کا نام ہے۔ نظم کچھ اس طرح ہے۔

درخت کا قتل

میرے قاتل کو کوئی بتائے
کہ وہ آشیانے سے سے ان کے پرندوں کو
محروم کرنے کا مجرم بھی ہے
بے زبانوں کے بچوں کا قاتل بھی ہے
میرے قاتل کوئی بتائے
کہ یہ قتل میرا انھیں میرے سائے کا ہے
جس میں تپتی دوپہروں میں گرمی مارے ہوئے
چین کی نیند سوتے تھے اور تازہ دم ہو کے
اپنے ٹھکانوں کی جانب نکل جاتے تھے
میرے قاتل کو کوئی بتائے
کہ یہ قتل آکسیجن کا ہے
آکسیجن کہ جو زندگی کی علامت بھی ہے
اور ضمانت بھی ہے

میرے قاتل کو کوئی بتائے
کہ یہ قتل میرا نہیں میرے سائے کا ہے
آشیانے کا ہے
آکسیجن کا ہے!!!۲۵

یہ خوبصورت نظم اس مجموعے کی دوسری براہ راست نظموں سے مختلف ہے اور اس میں وہی وقار اور گہرائی وتہداری پائی جاتی ہے جو محسن بھوپالی کی اصل شناخت ہے۔

اس طرح محسن بھوپالی کے سات شعری مجموعوں کا الگ الگ مطالعہ ختم ہوتا ہے۔اب اگر ان کے نظموں کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو ان میں چند بنیادی خوبیاں نکل کر سامنے آتی ہیں۔وہ یہ ہے کہ انھوں نے ابتدا میں کچھ نظمیں جو کہیں وہ بنیادی طور پر بچوں کے لیے ہیں جب کہ وہ خود بھی شاعری کے میدان میں نوخیز تھے اور ابھی سن بلوغت کو پہنچ ہی رہے تھے۔ظاہر ہے اس وقت کی نظموں میں فکر کی گہرائی بھی نہیں ہے اور فن کاری بھی نہیں ہے اس دور کی نظموں کا کمال یہی ہے کہ اس وقت بھی وہ اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب رہتے ہیں اور ان میں بہت سے تعمیری پہلو بھی موجود ہوتے ہیں۔

اس کے بعد کی نظموں میں جو پہلے شعری مجموعے میں ہیں وہ اپنی آواز کو تھوڑا تھوڑا پہچان چکے ہیں اور ان کا فکر واسلوب کا ایک رنگ بنتا جا رہا ہے۔اگر چہ انھیں ابھی کئی منزلیں طے کرنی تھیں۔پہلے مجموعے کی اشاعت کے وقت ممتاز حسین نے محسن بھوپالی کے شاعری کے بارے میں لکھا تھا۔

> ”محسن احساسات کا شاعر ہے۔اس کا ساز دل بڑا ہی نازک اور حساس ہے۔اس کے کلام میں سوز وگداز اور گھلاوٹ ہے بظاہر یہ جملہ رسمی معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے جب اسے ذہن میں رکھا جائے کہ محسن بھوپالی کے یہاں دور

حاضر کی وہ پٹی ہوئی خطابت نہیں ہے جو شعوری شاعری کے ساتھ
وابستہ ہوگئی ہے۔ اور یہ کس قدر اچھی بات ہے کہ جہاں انہوں
نے ایک طرح خطابت سے گریز کیا ہے وہاں انہوں نے دورِ
حاضر کے بے معنی ابہام سے اپنے کو دور رکھا ہے۔
اس کے کلام احساسات و تخیل اور جلائے معنی کا ایک بڑا
خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔" ۲٦

ممتاز حسین نے محسن بھوپالی کے شعری محاسن کو ان کے پہلے شعری مجموعے کی اشاعت کے وقت ہی شناخت کر لی تھی۔ لیکن اگر نظموں سے متعلق ان کے دوسرے مجموعہ ماجرا کا جائزہ لیا جائے تو اس میں محسن بھوپالی کے یہاں واضح ارتقا نظر آتا ہے۔ اس مجموعے میں وہ اپنے کمال کو پہنچ گئے ہیں۔ خیال میں گہرائی، بیان میں مہارت و تہداری، استعاری سازی اور ایک خاموش لیکن گہرا طنز ان کی شاعری کی بنیادی صفت ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں نزہت انیس نے لکھا ہے۔

"آپ کی ابتدائی نظموں میں جو مزاح کا عنصر تھا اس نے بعد میں
سنجیدہ طنز کی صورت اختیار کر لی اس کی چھپی ہوئی شکل آپ کے
ابتدائی کلام میں ہی مل جاتی ہے۔" ۲۷

محسن بھوپالی کی شاعری خاص طور سے نظموں کی ایک اور صفت یہ ہے کہ اس شاعری میں ان کا عہد سانسیں لے رہا ہے جو کچھ زمانے میں ہو رہا ہے وہ اس کی ترجمانی ان کی شاعری میں بھی نظر آ رہی ہے۔ ایسا ان کی ترقی پسندی سے وابستگی کی وجہ سے بھی ہے اور مشاعروں سے وابستگی کی وجہ سے بھی ہے۔ محسن بھوپالی مشاعروں میں بڑے مقبول تھے اور اس مقبولیت کی وجہ سے وہ سامعین کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے اس زمانے کے تمام مسائل سے وہ جوجھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کئی بار تو وہ بہت ہی غیر معمولی دلیری کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ پاکستان میں بار بار امریت آئی، جب جان کا بھی خطرہ ہو سکتا ہے لیکن انھوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر اپنے خیالات کا

بے لاگ اظہار کیا ہے۔ موضوعاتی نظمیں، شہر آشوبِ کراچی کی نظمیں تو اسی طرح کے حالات پر مبنی ہیں لیکن دیگر مجموعوں میں بھی اس طرح کی نظمیں برابر ملتی ہیں۔

قطعہ نگاری:

قطعہ نگاری کی صنف بھی اردو کی قدیم اصناف میں شامل ہے لیکن کلاسیکی شاعری میں اس کی آزاد حیثیت کم ہی رہی ہے۔ عام طور پر کسی غزل میں معنی یا موضوع کے اعتبار سے جب کم از کم دو یا اس سے زیادہ اشعار ایک تسلسل کے ساتھ ہو جاتے تھے یا کم از کم ایک ہی کیفیت کے ہو جاتے تھے تو ایسے اشعار کو غزل میں تسلسل کے ساتھ رکھ دیا جاتا تھا اور انھیں قطعہ کے طور پر اسی غزل کے ساتھ دیوان میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ ایسے اشعار کو کلاسیکی شاعری میں قطعہ بند اشعار کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ظہیر رحمتی لکھتے ہیں۔

> ''قطعہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''کسی چیز کا ٹکڑا۔'' اصطلاح میں مضمون کے اعتبار سے منفرد اشعار پر مبنی غزل کے کچھ اشعار میں ایک مسلسل اور نظم کی کیفیت کا حامل مضمون، قطعہ بند اشعار کہلاتا ہے۔ یعنی غزل کے کچھ اشعار کو مضمون کے اعتبار سے آپس میں متحد کرنا قطعہ بندی ہے۔ غزل میں قطعہ بند اشعار جہاں سے شروع ہوتے ہیں وہاں ''ق'' لکھ دیا جاتا ہے اور جہاں ختم ہوتے ہیں وہاں ایک لکیر کھینچ دی جاتی ہے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے آگے سے اشعار منفرد ہیں۔'' ۲۸

لیکن کلاسیکی شاعری میں بھی کچھ لوگوں نے خاص طور سے توجہ کے ساتھ قطعہ لکھے ہیں اور ان کے ذریعے بھی ان کو شہرت حاصل ہے۔ اردو کے سب سے بڑے شاعروں میر اور غالب کے یہاں بھی قطعہ بند اشعار کی خاصی تعداد ملتی ہے۔ کلاسیکی شاعری میں چونکہ یہ قطعہ بند اشعار غزل کی درمیان ہیں اس لیے لازمی طور پر ان میں

غزل کی ہی ہیئت ہوتی ہے۔یعنی ان میں وزن، ردیف اور قافیہ کا اہتمام ہوتا تھا۔ لیکن غزل اور قطعہ بند اشعار میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ غزل میں تمام اشعار معنی کے اعتبار سے آزاد ہوتے ہیں اور ہر شعر میں ایک نئے معنی نکلتے ہیں جب کہ قطعہ میں عام طور پر سارے اشعار میں ایک تسلسل ہوتا ہے۔ یا کم از کم ایک کیفیت کے اشعار ہوتے ہیں۔کلاسیکی شاعری میں غزل اور قطعہ میں بنیادی فرق یہی ہوتا تھا۔مطلع اور مقطع کے اعتبار سے غزل اور قطعہ میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے لیکن عام طور پر قطعہ میں مطلع اور مقطع کا اہتمام نہیں کیا جاتا ہے یہ کوئی شرط نہیں ہے اور بعض دفعہ **مطلع** اور مقطع کا بھی اہتمام کیا جاتا رہا ہے لیکن بہت کم ہوتا ہے۔

جدید قطعہ کی صنف در اصل کسی حد تک مشاعروں کی دین ہے، شاعر مشاعروں میں پوری غزل پڑھتے تھے لیکن جو شعر بہت مقبول ہوتے وہ انھیں بار بار مشاعروں میں پڑھنے لگتے دھیرے دھیرے وہ انھیں قطعہ کہنے لگے یا انھیں مربوط کر کے قطعہ کی شکل دے دی گئی۔بعض دفعہ ایسے دو اشعار بھی قطعہ کہے جانے لگے جن میں معنوی اعتبار سے ربط نہیں ہے۔در اصل جدید مشاعروں میں قطعہ کا رواج اس لحاظ سے بڑھا کہ شاعر مشاعروں میں مقبولیت کے لیے اپنی غزل کے سب سے اچھے اور جن میں مقبولیت حاصل کرنے کے سب سے زیادہ امکانات ہوتے تھے شاعروں نے پوری غزل پڑھنے سے پہلے کچھ ایسے ہی شعر پڑھنے شروع کیے۔یہی سب سے مقبول شعر دھیرے دھیرے قطعہ کی شکل میں مقبول ہونے لگے۔ان قطعات میں عام طور پر مطلع اور مقطع کی قید نہیں ہوتی ہے۔قدیم قطعات میں اشعار کی کوئی قید نہیں ہوتی تھی لیکن جدید قطعات میں صرف دو اشعار ہوتے ہیں۔احمد ندیم قاسمی نے قطعہ کی تعریف اس طرح کی ہے۔

> ''قطعہ نگاری ایک ایسا فن ہے جو مشکل بھی ہے مگر خاص طور سے آج کل ضروری بھی ہے۔مشکل اس لیے کہ جذبہ و احساس کی ایک پوری کائنات کو صرف چار مصرعوں میں سمیٹ لینے کا تخلیقی

عمل ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ
قطعے کے چاروں مصرعوں کے ہم وزن ہونے اور دوسرے اور
چوتھے مصرعے کے ہم قافیہ ہونے کی پابندی بھی ہے اور یہ شرط بھی
کہ آخری مصرعے کا در و بست اس سلیقے کا ہو کہ پورا قطعہ اس کی
چمک سے جگمگا اٹھے۔''۲۹؎

احمد ندیم قاسمی کے اس بیان سے واضح ہے کہ اب قطعہ کی صنف میں چار
مصروعوں یا دو اشعار کی قید کو لازمی طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ دوسرے اور چوتھے
مصرعوں کو ہم قافیہ ہونا بھی لازمی بتایا ہے اگر چہ انھوں نے ردیف کی کوئی پابندی نہیں
لگائی ہے غزل میں ردیف کی پابندی نہیں مانی گئی ہے لیکن غزل کی پوری روایت میں
بہت کم ایسی غزلیں ہیں جن میں ردیف نہ ہو۔ اس میں مطلع اور مقطع کی بھی کوئی بات
نہیں کی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ قطعہ میں مطلع اور مقطع بھی لازمی نہیں ہے۔ احمد
ندیم قاسمی نے قطعہ کی صنف کو ایک مشکل صنف بتایا ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ اس
میں ''جذبہ واحساس کی ایک پوری کائنات کو صرف چار مصرعوں میں سمیٹ لینے کا تخلیقی
عمل'' ہوتا ہے اس پر تھوڑا اختلاف کیا جا سکتا ہے کیونکہ جس شاعری کے مرکز میں غزل
ہو اور غزل کے صرف دو مصروعوں یا ایک شعر میں ہزاروں شعرا یہ کام کرتے آئے ہوں
ان کے لیے چار مصرعوں یا دو شعروں کا ملنا تو ایک طرح کی وسعت اور آزادی ملنا ہے
اور یہ ایک آسانی فراہم کرنے والی بات ہے۔ لیکن احمد ندیم قاسمی جس عہد اور جس
ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اس میں غزل کے لیے ماحول بہت سازگار نہ تھا۔

احمد ندیم قاسمی نے اس اقتباس میں ایک اور اہم بات کی ہے ان کا کہنا ہے
کہ آخری مصرعے کو اس سلیقے سے سجایا جائے کہ اس سے پورا مصرا جگمگا اٹھے یہ بہت
اہم ہے قطعہ میں آخری مصرعہ میں احساس ہونا چاہیے کہ یہاں بات مکمل ہو گئی ہے۔
وہ ایسا ہونا چاہیے کہ پورا قطعہ اسی سے روشن ہوتا ہے اور بہت پر تاثیر ہونے کی بات
کہی گئی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے اس بہت اہم مضمون میں قطعہ کی روایت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، انھوں نے ایک طرح سے کلاسیکی شاعری کے قطعات کو نظر انداز کیا ہے۔ یعنی کلاسیکی شاعری کے قطعہ بند اشعار کو قطعہ کی روایت میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ انھوں نے اسی شاعری کو قطعہ مانا ہے جو چار مصرعوں میں ہو، وہ لکھتے ہیں۔

''قطعہ نگاری کی روایت نئی سہی مگر جوش ملیح آبادی، احسان دانش، اختر انصاری دہلوی اور خود میں نے اب تک سینکڑوں قطعے لکھے ہیں اور یوں قطعے کو اردو میں ایک منفرد صنف شعر کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ یہ سب قطعے دراصل مختصر نظمیں ہیں۔ یوں سمجھے کہ مختصر نظم کی ایک مہذب اور ترقی یافتہ صورت ہے۔ کم سے کم ان لوگوں کے لیے تو یقیناً ہے جو وزن اور قافیہ و ردیف کی پابندیوں کو شعر کے اثر نفوذ کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں اور جن کے اظہار کو یہ ''پابندیاں'' آسان بنانے میں مفید ثابت ہوئی ہیں۔''[۳۰]

احمد ندیم قاسمی اس تعریف میں ایک طرف قطعہ کو قطعہ بند اشعار کی روایت سے قطعہ نگاری کی روایت کو منقطع کرتے ہیں۔ دوسرے وہ قطعہ کو غزل کی روایت سے بھی الگ کرتے ہیں یعنی دو مصرعوں میں بات مکمل کرکی غزل کی روایت کو چار مصرعوں میں مکمل کرنے کی آزادی کی بات نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ اس کا رشتہ نظم سے جوڑتے ہیں اور کہتے ہے کہ یہاں آزادی نہیں ملی بلکہ صرف چار مصرعوں میں بات مکمل کرنے کی پابندی کرنی ہے اور یہاں ایک موضوع بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ مضمون کی شکل میں موضوع غزل میں بھی ہوتا ہے۔ وہ نظم کی اس روایت کی بات کرتے ہیں جو وزن، قافیہ اور ردیف کی ''پابندی'' کو شعر کے اثر نفوذ کا لازمی سمجھتے ہیں اور یہ بھی کہ یہ ایک مہذب اور ترقی یافتہ ہے شکل ہے۔ اس طرح احمد ندید قاسمی نے قطعہ کو ایک نیا موڑ دے دے ہے۔ اب تک قطعہ کو غزل سے جوڑا جاتا تھا لیکن انھوں نے اسے مختصر نظمیں کہا ہے۔

قطعہ کے ان تمام شعری محاسن کی روشنی میں جب ہم محسن بھوپالی کے قطعات جائزہ لیتے ہیں تو ان کے یہاں جو پہلی بات نظر وہ آتی ہے کہ وہ قطعہ کی اسی روایت کے پیروکار ہیں جس کی حمایت احمد ندیم قاسمی نے کی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بھی لیکن سب سے زیادہ اہمیت ہیئت کے اعتبار سے ہے کہ ان کے یہاں وہی قطعات ملتے ہیں جس کی تعریف احمد ندیم قاسمی نے کی تھی۔ ان کے یہاں دو شعر سے زیادہ کے قطعات بالکل نہیں ہے۔ محسن بھوپالی کے یہاں قطعہ کی صنف کافی اہم صنف ہے، اور انھوں نے بڑی تعداد میں قطعات کہے ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے ''شکستِ شب'' (۱۹۶۱ء) کا آغاز ایک قطعہ سے ہوتا ہے۔ اس قطعہ کی وجہ تخلیق خود محسن بھوپالی نے ایک انٹرویو میں اس طرح بتائی ہے۔

> ''قائداعظم کی وفات کے بعد تقریباً یہ طے ہو گیا تھا کہ اخبارات کی شہ سرخیاں چھپ گئی تھیں کہ اب نواب بھوپال گورنر جنرل مقرر کیے جانے والے ہیں۔ پھر خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل بنایا گیا اور چند ماہ بعد انھیں وزیر اعظم کے عہدے پر مقرر کر کے اچانک غلام محمد گورنر جنرل بن گئے تو ہم جیسے نوجوانوں کا پیمانۂ صبر چھلک پڑا اور میں نے فوری طور پر یہ شعر کہا۔ پھر کچھ عرصے بعد اس شعر کو جب قطعے کی شکل میں تبدیل کیا تو صیغۂ واحد کو جمع میں تبدیل کر دیا۔''[۳۱]

یہ پورا واقعہ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء کا ہے اس واقعے نے محسن بھوپالی کو بہت صدمہ پہنچایا۔ محسن بھوپالی نے غلام محمد کے گورنر جنرل بنائے جانے کے ردِ عمل کے طور پر احتجاجاً پہلے ایک شعر کہا تھا وہ شعر حسب ذیل تھا۔

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل اسے ملی جو شریک سفر نہ تھا

اس کے بعد محسن بھوپالی نے شعر کو قطعہ میں تبدیل کر دیا ساتھ ہی شعر میں

معمولی تبدیلی کر کے جو صیغۂ واحد میں تھا اسے بدل کر صیغۂ جمع میں کر دیا۔ اب اس قطعہ کی صورت کچھ اس طرح ہو گئی۔

تلقین اعتماد وہ فرما رہیں آج
راہ طلب میں خود جو کبھی معتبر نہ تھے
نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے ۳۲

یہ وہ شعر (بعد میں قطع) تھا جس نے محسن بھوپالی کی دنیا بدل دی، اس قطعہ میں حالات پر ایسا گہرا طنز تھا کہ یہ شعر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ پیر علی محمد راشدی نے اسے پاکستان کی قومی اسمبلی میں پڑھا اور اگلے دن تمام اخباروں میں یہ سرخی میں تھا۔ خاص طور سے دوسرا شعر تو مقبولیت کی تمام حدیں پار کر گیا۔ ابھی وہ ۲۲ سال کے نوجوان تھے لیکن ان کی مقبولیت اور شہرت تمام پاکستان میں پھیل گئی۔ وہ جہاں جہاں جاتے تو اس شعر کے خالق کے طور پر انھیں بلایا جاتا۔ اردو کے ان سب سے مقبول اشعار میں اس کا شمار ہونے لگا جو بات بات میں سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ اتنی جلدی کسی شعر کو ضرب المثل بنتے ہوئے بہت کم دیکھا گیا ہے جتنی جلدی یہ شعر ضرب المثل بنا۔

تو اس طرح کے حالات پر محسن کے اشعار بہت مقبول ہونے لگے اور اس طرح ان کی شاعری کی ایک شناخت بن گئی اسے سیاسی حالات پر تبصرہ کہا جائے یا اسے احتجاجی شاعری کا نام دیں، جو بھی کہیں لیکن محسن بھوپالی کے اس نوعیت کے اشعار بہت مقبول ہوئے۔ شاید اس طرح کے حالات پر سلیقے سے شعر کہنے والوں میں ان کا نام آنے لگا۔ شاید ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ محسن بھوپالی کے یہاں احتجاجی شاعری کافی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ جو مشاعروں اور ادبی حلقوں میں بھی کامیاب رہی، اس کے ساتھ ساتھ بہت سے سیاسی و سماجی حلقوں میں بھی ان کی مقبولیت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ خاص بات یہ ہے کہ اس طرح کی شاعری کرنے میں محسن بھوپالی نے نہایت

دلیری سے کام لیا۔ گورنر جنرل کے خلاف اس طرح کھل کر شعر کہنا بہت دل گردے کا کام تھا ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن محسن بھوپالی نے بات کہنے میں اپنے انجام کی کوئی پرواہ نہیں کی، یہ وہ زمانہ تھا جب فیض احمد فیض ابھی جیل میں تھے اور ایک تذبذب جاری تھا انھیں چھوڑا جائے گا یا پھانسی دے دی جائے گی لیکن پھر بھی محسن بھوپالی نے ایسے اشعار کہے۔ یہ سلسلہ اوران صفات کی شاعری محسن بھوپالی کے یہاں تقریباً پورے کلام میں ملتی ہے۔ یہ صرف نوجوانی کا جوش نہیں تھا بلکہ احتجاج محسن بھوپالی کی شخصیت کا ایک ضروری حصہ بن گیا اوران کی تمام شاعری میں یہ رنگ ہمیشہ قائم رہا کبھی ہلکا تو کبھی گہرا۔

محسن بھوپالی کے پہلے مجموعے 'شکستِ شب' میں اس ابتدائی قطعہ کے علاوہ ۱۵ قطعات اور بھی شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر میں قطعہ کے ہیئتی اور فنی خوبیاں موجود ہیں اور یہ قطعات غور وفکر کی ایک سنجیدہ دعوت دیتے ہیں۔ لیکن ان میں سیاسی حالات پر ردعمل زیادہ ہے، لفظوں سے کھیلنے کا عمل بھی اور غزل اور اردو شاعری کی روایت سے استفادہ کرنے کا عمل بھی ہے۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

رہِ وطن میں شہیدوں نے کیوں دیا تھا لہو
اسی لیے کہ تعصب یہاں جنم پائے
چراغ خون کے کیا اس لیے جلائے تھے
سجے سجائے ہوئے گھر میں آگ لگ جائے

چلے تھے وادیٔ گلپوش کی تمنا میں
ہمارے ذہن میں کانٹوں کا سلسلہ تو نہ تھا
یہ ایک دن کا چراغاں یہ ایک دن کی بہار
خطا معاف ہمارا یہ مدعا تو نہ تھا

آرزوئے نو بہ نو دی وعدۂ فردا دیا
کچھ کھلونے دے کر فطرت نے ہمیں بہلا دیا
زندگی نا معتبر اور مرگ جبرِ ناگہاں
بخشنے والے نے سب کچھ بخش کر بھی کیا دیا

جہاں جہاں بھی ملے خار چن لیے میں نے
کہاں کہاں پہ مرا ذوقِ غم پناہ نہ تھا
پہنچ کے یوں سرِ منزل بھلا دیا تم نے
میں ہم سفر تھا تمہارا غبار نہ تھا

ان قطعات میں بار باران حالات کا ذکر آتا ہے جو مجاہدین آزادی اور پاکستان کی شکل میں ایک اسلامی مملکت کا خواب دیکھتے ہے اور اس کی تکمیل کے لیے کیا کیا جد جہد کی اور قربانیاں دیں۔ ان لوگوں نے ایک حسین خواب پاکستان کے وجود کے ساتھ منسلک کیا تھا لیکن پاکستان کی شکل میں جو وطن یا گلشن ملا وہ ان خوابوں سے یکسر مختلف تھا۔ وجود میں آئے اس وطن میں دوسروں کے تئیں تعصب تھا، لوگوں میں خودغرضی تھی آرام و آسائش کے سارے سامان چند لوگوں تک محدود ہو گئے تھے جب کہ باقی لوگ ہر طرح کی مشکلوں سے دو چار تھے، ان کے گھر جل رہے تھے۔ آپس میں ہی لوگ ایک دوسرے کے وجود کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اور اس وطن کے لیے جن لوگوں نے سیکڑوں قربانیاں دی انھیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ ان قطعات میں ایک ایسے نوجوان کے خوابوں کے شکست کی صورت حال نظر آتی ہے، جس نے قیام پاکستان کے لیے جدو جہد کی تھی اور جب پاکستان قائم ہو گیا تو اس سے چند لوگوں کو ہی فائدہ پہنچا۔ لیکن ان سب قطعات میں شاعر قیام پاکستان کے فیصلے کو غلط نہیں کہا ہے۔ اس کا افسوس نہیں ہے اسے بھی کہیں نہ کہیں کہ امید ہے کہ حالات بہتر ہو جائیں گے۔

اس کے بعد محسن بھوپالی کا دوسرا شعری مجموعہ ''جستہ جستہ'' ۱۹۶۹ء میں شائع

ہوا۔ یہ پورا مجموعہ قطعات پر مشتمل ہے۔ اس بات سے محسن بھوپالی کی شاعری میں قطعہ کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔ اس مجموعے کا آغاز بھی محسن بھوپالی کے اسی قطعہ سے ہوتی ہے جس سے ان کے پہلے مجموعے کا آغاز ہوا تھا یعنی ''منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے'' جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس کا دوسرا قطعہ بھی ایک غیر معمولی قطعہ ہے اور اس کو بھی پہلے قطعہ کی طرح ہی مقبولیت ملی تھی۔ وہ قطعہ اس طرح ہے۔

جاہل کو اگر جہل کا انعام دیا جائے
اس حادثۂ وقت کو کیا نام دیا جائے
میخانے کی توہین ہے رندوں کی ہتک ہے
کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

جستہ جستہ کے کچھ اور قطعات پر نظر ڈالنے کے بعد ہم اس مجموعے کی قدر و قیمت کا تعین کر سکتے ہیں اور اس پر بھی غور و فکر کر سکتے ہیں کہ اس مجموعے کی فکر و فن کی کیا صفات ہیں اور آخر شاعر قطعات کو کیوں اتنی زیادہ اہمیت دے رہا ہے۔ جب کہ عام طور پر قطعات کو اردو شاعری کی پوری تاریخ میں قطعات کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی کہ اس کا دوسرا شعری مجموعہ ہی خالص قطعات پر مبنی ہو۔ جستہ جستہ کے چند قطعات کچھ اس طرح ہیں۔

زندگی کی بدل گئیں قدریں
فکر ہے جبر کی پناہوں میں
علم رسوا ہے شاہ راہوں پر
جہل پلتا ہے خانقاہوں میں

اوج پر ہے کمالِ بے ہنری
باکمالوں میں گھر گیا ہوں میں
روشنی روشنی کی دشمن ہے

کن اجالوں میں گھر گیا ہوں میں

جہاں جہاں بھی ملے خار چن لیے میں نے
کہاں کہاں یہ مرا ذوقِ غم پناہ نہ تھا
پہنچ کے یوں سرِ منزل بھلا دیا تم نے
میں ہم سفر تھا تمہارا، غبارِ راہ نہ تھا

ناکردہ گناہی کی ہمیں داد ملے گی
ہم لوگ خطا وار ہمیشہ نہ رہیں گے
رستے ہوئے زخموں کی زباں بول رہی ہے
یہ درد، یہ آزار ہمیشہ نہ رہیں گے

پہلے قطعہ میں قدروں کے زوال اور خاص طور سے علم کے بے قدری پر گہرا طنز ہے۔ خانقاہیں جو علم و ادب کے مرکز تھے وہاں بھی اب جہل فروغ پا رہا ہے۔ دوسرے قطعہ میں اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ بے ہنری کو فروغ حاصل ہو رہا ہے، ایسے باکمالوں میں گھرا ہوا ہوں جو اصلاً کسی کمال سے واقف ہی نہیں ہیں اور سب سے بڑا المیہ ہے کہ ایسے حالات بن گئے ہیں کہ روشنی جو تمام امیدوں کا مرکز ہوتی ہے اب خود روشنی کی دشمن ہوگئی ہے۔ اگلے قطعہ میں اس بات کا دعویٰ ہے کہ میں نے منزل کی راہ میں جتنے بھی خار ملے سب کو چن لیا، اسی خار چننے کی چاہت میں کہاں کہاں نہ گیا؟ لیکن منزل پر پہنچنے کے بعد مجھے اس طرح بھلا دیا گیا جیسے میں شریک سفر تھا ہی نہیں جیسے کوئی غبار راہ تھا جسے جھٹک کر اپنے آپ سے دور کر دیا گیا۔ اگلے شعر میں ناکردہ گناہوں کی دادخواہی میں گناہوں کی معافی کی امید کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور جو زخم رس رہے ہیں ان سے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ یہ دکھ درد، یہ آزار ہمیشہ تو نہیں رہیں گے۔ ان سارے قطعات میں وہی دکھ ہے جو ملک میں ایک عام انسان محسوس کر رہا ہے۔ لیکن ہر شعر ایک نئے لہجے میں کہا گیا ہے کہیں بھی براہ راست اظہار خیال نہیں

ہے۔ ہر جگہ کسی تشبیہ یا استعارے سے کام لیا گیا ہے۔ ان قطعات کو پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ محسن اب شعر کہنے میں قدرت رکھتے ہیں انھیں اپنی روایت سے اچھی واقفیت ہے وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بات کو صرف کہہ دینے سے شاعری نہیں ہو جاتی ہے بلکہ اس کا ایک خاص سلیقہ ہوتا ہے جسے وہ بخوبی نبھانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

ان تمام قطعات میں محسن بھوپالی کی جو سب سے خاص بات نظر آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ اب ان کی بیشتر شاعری کا موضوع یا تو سیاسی ردعمل ہے یا اخلاقی زوال ہے لیکن بات اتنے موثر انداز میں ہے اور ان کا طنزیہ لہجہ ہر جگہ ایک بھرپور وار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ قطعہ کہنے کے ہنر سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں یعنی پہلے بات کو ایک خاص انداز سے شروع کریں، پھر اس بات کو آگے بڑھائیں اور تیسرے مصرعے میں بات کو کلائمکس پر پہنچا کر چوتھے مصرعے میں ایک دم سے چونکاتے ہوئے بھرپور وار کیا جائے۔

محسن بھوپالی کی شعری مجموعہ 'روشنی تو دیے کے اندر ہے' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا یہ محسن بھوپالی کا آخری مجموعہ ہے جس میں دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ ۳۳ قطعات بھی ہیں۔ ان قطعات میں بھی محسن بھوپالی کے دیگر مجموعوں کے قطعات کی خوبیاں پائی جاتی ہیں لیکن اس مجموعے میں ایک ٹھہراؤ سا زیادہ نظر آتا ہے سیاسی حالات پر ردعمل ابھی بھی لیکن نظر اس کے علاوہ بھی اور آگے بھی کچھ دیکھتی ہے۔ یہاں فکر میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہے لیکن اس میں کچھ وسعت ضرور نظر آتی ہے۔ چند قطعات پیش ہیں جو اس بات کی سند پیش کرتے ہیں۔

جمہوریت کی خیر ہو، اس مملکت کی خیر ہو
جو وقت کے غلام تھے لمحوں میں بک گئے
چشمِ فلک نے دیکھا ہے ایسا بھی ماجرا
لاکھوں کے ترجمان کروڑوں میں بک گئے

آنکھ بے وجہ نم نہیں ہوتی
کچھ نہ کچھ تو سبب رہا ہوگا
یا کوئی چیز پڑ گئی ہوگی
یا کوئی یاد آ گیا ہوگا

'منزل' میں کچھ قدیم طرز کے قطعات یعنی غزل میں جو خیال کے اعتبار سے مسلسل شعر ہو گئے اور جن کے لیے دو اشعار یا چار مصرعوں کی قید نہیں ہوتی تھی بھی پائے جاتے ہیں۔ان پر قطعہ نہ لکھ کر قدیم دیوانوں میں شامل غزلوں میں 'ق' لکھ کر شامل کیا گیا ہے ان اشعار کو قطعہ بند اشعار کہا جاتا ہے۔ یہ قطعات دو سے زیادہ شعروں یعنی چار سے زیادہ مصرعوں پر مبنی ہیں۔

ق

یہ امتیاز ہے، اہل وفا کے مشرب میں
روایتوں سے کبھی سرکشی نہیں ہوتی
محاذِ جنگ سے پسپائیاں تو جائز ہیں
محبتوں میں مگر واپسی نہیں ہوتی
وہ جن کے گھروں کی فضا خوش گوار ہوتی ہے
انھیں گھروں میں تو اکثر خوشی نہیں ہوتی

ایک پوری غزل قطعہ بند ہے جو ''نذر مجروح سلطان پوری'' ہے اور یہ غزل مجروح سلطان پوری کی مشہور غزل ''ہم ہیں مطاع کوچۂ و بازار کی طرح'' کی زمین میں ہے۔اس مجموعے میں اس طرح کے کل تین قطعات ہیں جو کلاسیکی شاعری کی طرح قطعہ بند اشعار کہے جا سکتے ہیں۔

محسن بھوپالی کے قطعات پر احمد ندیم قاسمی نے جو اظہار خیال کیا ہے وہ بہت معتبر بھی ہے اور اس میں ان قطعات کو سمجھنے کی ایک بہت سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔اور

کس حد تک وہ محسن بھوپالی کے قطعات پر فیصلہ کن بات کہتے ہیں۔

"محسن نے نہ صرف قطعے کے گذشتہ پینتیس چالیس برس کی روایت سے استفادہ کیا ہے بلکہ اس نے قطعے کے کینوس کو مزید وسعت بھی دی ہے۔ اس نے اپنے قطعات میں سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل کو موضوع بنایا ہے اور اسے محض حسن و عشق کے مسائل سے محدود نہیں رکھا۔ پھر قطعے کو قاری کے دل میں اتارنے کے لیے اس کے پاس ایک نہایت موثر ہتھیار موجود ہے اور یہ اس کا طنزیہ لہجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بیشتر قطعات کے آخری مصرعوں کا نکیلا طنز قاری کے ذہن میں پیوست ہو جاتا ہے۔"۳۳

محسن بھوپالی کے قطعات پر مجموعی طور پر غور و فکر کرنے واضح ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے محسن بھوپالی نے قطعات کو موضوع کے اعتبار سے کافی وسعت دی ہے اور ان میں سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ محسن بھوپالی کے قطعات کا ایک بہت اہم وصف ان کا طنزیہ لہجہ ہے، خاص طور سے چوتھا مصرعہ۔

غزل گوئی:

غزل اردو کی سب سے مقبول اور معتبر صنف رہی ہے، اور ہر عہد میں اس صنف میں طبع آزمائی کرنے والے شعرا کی تعداد سب سے زیادہ رہی ہے۔ غزل کی لفظیات اور ڈکشن کو دیکھا جائے تو دوسری اصناف کے مقابلے میں اس صنف میں کچھ نیا کرنے یا اپنی منفرد شناخت بنانے کے لیے اس صنف میں سب سے محدود مواقع ہیں۔ اس صنف میں تجربات کرنے کے بھی سب سے کم امکانات ہیں۔ چاہے وہ فکری اعتبار سے ہوں یا فنی اعتبار سے۔ لیکن اس کے باوجود غزل اپنے قارئین اور سامعین کو بہت متاثر کرتی ہے، اس لیے بیشتر شعرا غزل میں طبع آزمائی ضرور کرتے

ہیں۔ گرچہ غزل شاعر کو منفرد شناخت بنانے میں ہر جگہ رکاوٹ بنتی ہے۔ غزل جلدی کسی شاعر کے ڈھانچے میں نہیں ڈھلتی ہے بلکہ اس کو اپنے سانچے میں بہت جلدی ڈھال لیتی ہے۔ لیکن پھر بھی اکثر شاعر اپنی غزلوں کے ذریعے ہی جانے جاتے ہیں۔

محسن بھوپالی نے جب شاعری شروع کی اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی، اور ترقی پسند تحریک میں غزل کو وہ اہمیت حاصل نہ تھی جو موضوعاتی نظم کو حاصل تھی۔ شاید اس کی یہی وجہ تھی کہ غزل فکری اور فنی دونوں اعتبار سے اپنا ایک مزاج رکھتی ہے جب کہ ترقی پسندوں کے یہاں پیغام زیادہ اہم تھا طرزِ اظہار اور ہیئت کی اہمیت ثانوی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ترقی پسند عہد میں بھی بیشتر شعرا کچھ نہ کچھ غزلیں کہتے ہی تھے۔ ترقی پسند تحریک کے معماروں مثلاً فیض احمد فیض، مجروح سلطان پوری، مجاز، معین احسن جذبی، جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی وغیرہ اس زمانے کے اہم ترقی پسند شعرا تھے اور مجروح کے علاوہ تمام شعرا کی بنیادی شناخت نظموں سے ہے لیکن ان تمام شعرا نے نہ صرف غزلیں کہی ہیں بلکہ ایسی غزلیں کہی ہیں کہ لوگ انھیں بار بار پڑھتے ہیں اور وہ اردو غزل کی تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں۔

محسن بھوپالی کی ابتدا بچوں کی نظموں سے ہوئی تھی اور اس زمانے کی نظموں میں پیغام بہت توانا ہے۔ چونکہ اچھی غزل کہنا غزل کی روایت کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں ہے اس لیے محسن بھوپالی نے نظموں سے شروعات کے باوجود شاعری میں جیسے جیسے آگے قدم بڑھایا وہ شاعری اور خاص طور سے غزل کی روایت کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے گئے اور جلد ہی محسن بھوپالی بھی غزل کے کشش میں گرفتار ہوئے، اور انھوں نے غزل کو ان کے تخلیقی اظہار میں بنیادی اہمیت ملنے لگی۔

محسن بھوپالی کی شاعری میں غزلوں کا بہت اہم مقام ہے۔ زمانی اعتبار سے ان مجموعوں کی ترتیب حسب ذیل ہے جن میں غزلیں موجود ہیں۔ ''مجموعۂ سخن'' ۱۹۹۲ء تک کی محسن بھوپالی کی تمام شاعری کا کلیات ہے اس لیے اس میں ان کی شاعری کی تمام اصناف موجود ہیں کیونکہ محسن بھوپالی اس وقت تک اپنی تمام اصناف میں شاعری

کر چکے تھے۔ اس لیے محسن بھوپالی کے شعری مجموعوں میں جن میں غزلیں ہے کی کل تعداد صحیح معنی میں پانچ ہے۔ باقی دونوں مجموعوں میں ان کی شاعری کا کلیات اور انتخاب ہے وہ علیحدہ کلام نہیں ہے۔

۱۔ شکستِ شب (نظموں، غزلوں اور قطعات پر مبنی) ۱۹۶۱ء

۲۔ ماجرا (نظموں اور غزلوں پر مبنی) ۱۹۸۱ء

۳۔ گردِ مسافت (نظموں، غزلوں اور ہائیکو پر مبنی) ۱۹۸۸ء

۴۔ مجموعۂ سخن (اب تک کے تمام مجموعوں کا کلیات) ۱۹۹۲ء

۵۔ روشنی تو دیے کے اندر ہے ۱۹۹۶ء
(نظموں، غزلوں، قطعات اور نظمانوں پر مبنی)

۶۔ منزل (غزلوں، نظموں اور نظمانوں پر مبنی) ۲۰۰۳ء

۷۔ محسن بھوپالی کے سو شعر ۲۰۰۵ء

محسن بھوپالی کا پہلا شعری مجموعہ شکستِ شب ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تو اس وقت محسن بھوپالی محض ۲۹ سال کے تھے لیکن ان کی شاعری کی عمر تقریباً پندرہ سال تھی کیونکہ انھوں نے تقریباً چودہ پندرہ سال کی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی۔ شکست شب میں اس وقت تک کہی گئی تمام شاعری نہ ہو کر ایک انتخاب ہے۔ اس زمانے کی کہی ہوئی ان کی کچھ نظمیں تو بہت بعد میں ''موضوعاتی نظمیں'' میں شائع ہوئیں جب کہ یہ ان کے بالکل ابتدائی زمانے کلام تھا اور شکستِ شب میں شامل نہیں کی گئی تھیں۔ لیکن انھوں نے کچھ غزلیں بھی اور کہیں تھیں؟ اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البتہ اس پہلے مجموعے پر ایک سرسری نظر ڈالنے پر بھی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ محسن بھوپالی اب تک غزلوں میں کافی مشاق ہو چکے تھے اور ان میں ناپختگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ پہلے مجموعے کی نظموں اور قطعات کے مقابلے غزلوں میں ذاتی تجربات و احساسات زیادہ ہیں۔ جب کہ نظموں اور قطعات میں زیادہ تر سیاسی حالات، پاکستان کا قیام، وہاں کے سیاسی حالات اور تقسیم ہند، اور پاکستان کو اپنا ملک بنانا یہ موضوعات

ہی زیادہ تر موضوعِ بحث آئے ہیں۔ اگرچہ غزلوں میں بھی ان موضوعات سے یکسر آزادی تو نہیں ہے لیکن بہر حال دیگر موضوعات بھی پائے جاتے ہیں۔ پہلے مجموعے سے چند اشعار کچھ اس طرح ہیں۔

فصل گل کے آتے ہی موج غم کی یورش ہے
آسماں کو کیا کہیے باغباں کی سازش ہے
راہبر بنے ہیں سب راہزن نہیں کوئی
پھر بھی کارواں محسن کیوں شکارِ گردش ہے

زباں پہ مہر لگانا تو کوئی بات نہیں
بدل سکو تو بدل دو مرے خیالوں کو

المدد اے چاک دامانوں قبا خطرے میں ہے
ڈوبنے والو بچاؤ ناخدا خطرے میں ہے

رہیں گے سرِ دار بھی حق پہ قائم
کہ منصور دوراں ہیں ہم بندہ پرور

ہم نقیب بہار ہیں محسن
وقت کے رخ کو ہم بدلتے ہیں

اک حسیں پر فریب وادی میں
کارواں آ کے رک گیا لوگوں

ناخدا ڈوبتی کشتی کا ہو جیسے بے چین
زندگی گھوم کے چاروں طرف یوں دیکھتی ہے

دشمن جاں وہی ہیں کیا کہیے
جن پہ ہم جاں نثار کرتے ہیں
اک تیری یاد بھولتی ہی نہیں
جبر دل پر ہزار کرتے ہیں

صبا کی ساری لطافت ہے باد سرسر میں
خزاں نہ ہو تو بہاروں کو کون پہچانے

منحصر اہل ستم پر ہی نہیں ہے محسن
لوگ اپنوں کی عنایت سے بھی مر جاتے ہیں

کاکلِ گیتیِ دوراں کی خبر لے ائے دوست
زلف جاناں تو بہر حال سنور سکتی ہے

غم حبیب و غمِ دو جہاں سے کیا کم ہیں
وہ رنج و غم جو کسی مہرباں سے ملتے ہیں

یورش درد نے پندار وفا توڑ دیا
ہم بھی نادم ہیں بہت حسن پشیماں کی طرح

زیست ہم سائے سے مانگا ہوا زیور تو نہیں
ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کھو جانے کا

بڑھے اور ظلمت ہمیں غم نہیں ہے
چراغوں کی لو آج بھی کم نہیں ہے

ان اشعار کے مطالعے سے جو پہلا تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ اک درد بھری آواز ہے جس میں شاعر کا عہد دھڑک رہا ہے۔ یہ شاعری تخیل اور مضمون آفرینی پر نہیں بلکہ زندگی کے تلخ وتند تجربات سے نکلی ہے، جسے محسن بھوپالی نے غزل کی زبان دے دی ہے۔ اس مجموعے کے بڑے حصے میں کہیں نہ کہیں وقت اور زمانے کے نامسائد حالات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ لیکن اس میں ناامیدی کہیں نہیں ہے۔ شاعر ان حالات کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی وجوہات کو جاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ شب کی تمام المناکیوں کے باوجود 'شکستِ شب' کی بات کر رہا ہے۔ اور زندگی کی مثبت قدروں کی بات کر رہا ہے۔ محسن بھوپالی نے شاعری کے اپنے رویے کے بارے میں پیش لفظ میں لکھا ہے۔

> ''میں انفرادی جذبات اور داخلی احساسات کے بجائے خارجی حقیقتوں اور ان کی ہیئتی تبدیلیوں سے زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ اسی لیے میری بیشتر تخلیقات اجتماعی زندگی اور اس کے گوناگوں متحرک عوامل کا مظہر ہیں۔ ماحول کے دل آویز ورنگین پردوں میں چھپی ہوئی تلخ حقیقتوں کا اظہار میرا مسلک رہا ہے اور پستی کی وادیوں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو سہارا دینا میرا نظریۂ فن۔ تاکہ جدید معاشرہ ''کیا ہے'' اور ''کیا ہونا چاہیے'' کے بارے میں سوچ سکے، سمجھ سکے اور عمل کر سکے۔ اور آج کے سائنسی دور کا یہی تقاضا ہے۔''[۳۴]

محسن بھوپالی کے اعتراف سے ان کا نصب العین سمجھ میں آجاتا ہے کہ شاعری سے وہ کیا کرنا چاہتے ہیں، ان کے نزدیک شاعری کے کیا تقاضے ہیں؟ وہ بہت واضح ہیں اور وہ انھیں تقاضوں کو اپنی شاعری سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔

محسن بھوپالی کی غزل گوئی جہاں ایک طرف فکر و آہنگ میں روایت کی پاسداری کرتی ہوئی نظر آتی ہے وہیں کہیں کہیں جدید طرزِ اظہار بھی ہے لیکن انھوں نے زبان کے ساتھ اس طرح کے تجربات نہیں کیے جو بعد میں جدیدیت کی خاص شناخت

بنی۔ ان کے لہجے میں ایک قسم کا ٹھہراؤ ہے اور روایت شناسی اور روایت کی پاسداری ان کا خاص انداز ہے۔ درج بالا اشعار میں چند تراکیب کچھ اس طرح ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں غزل کی زبان میں گفتگو کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ فصل گل، موج غم کی یورش، باغباں کی سازش، شکارِ گردش، زباں پہ مہر، چاک دامانوں، قبا خطرے میں، ناخدا خطرے میں، سرِ دار، منصور دوراں، نقیب بہار، ڈوبتی کشتی، بادِ سر سر، کاکل گیتیِ دوراں، زلف جاناں، یورش درد، پندار وفا، حسن پشیماں وغیرہ ایسے الفاظ و تراکیب ہیں، جن سے محسن بھوپالی کے یہاں کلاسیکی رنگ کی جھلک ملتی ہے یہ سارے الفاظ و تراکیب کلاسیکی شاعری سے تعلق رکھتی ہیں۔ جنھیں کلاسیکی شاعری میں معنی کی مختلف جہتوں کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن محسن بھوپالی نے انھیں جدید زندگی کے احساسات و تجربات کی روشنی میں بہت خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ یہ الفاظ تو پرانے ہیں لیکن محسن بھوپالی نے انھیں نئے حالات کے ساتھ منسلک کر کے پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ تراکیب تو بہت ہی نادر ہیں، جنھیں چبھتے ہوئے اور طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ معروف ترقی پسند نقاد ممتاز حسین نے اس مجموعے کی اشاعت کے وقت اس کے فلیپ پر لکھا تھا۔

> ''محسن احساسات کا شاعر ہے، اس کا ساز دل بڑا ہی نازک اور حساس ہے۔ اس کے کلام میں سوز و گداز اور کھلاوٹ ہے بظاہر یہ جملہ رسمی معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے جب اسے ذہن میں رکھا جائے کہ محسن بھوپالی کے یہاں دورِ حاضر کی وہ پٹی ہوئی خطابت نہیں ہے جو شعوری شاعری کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے اور یہ کس قدر اچھی بات ہے کہ جہاں انھوں نے ایک طرف خطابت سے گریز کیا ہے وہاں انھوں نے دورِ حاضر کے بے معنی ابہام سے اپنے کو دور رکھا ہے۔
>
> اس کے کلام میں احساسات و تخیل اور جلائے معنی کا ایک بڑا

خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔"۳۵؎

اس سے ظاہر ہے کہ محسن بھوپالی بنیادی طور پر احساسات و جذبات کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں حالات پر ردعمل ہیں، لیکن ان کی شاعری میں سوز و گداز بھرپور ہے۔ لہجے میں ایک قسم کا جوش و جذبہ پایا جاتا ہے۔ جو انھیں ایک منفرد شناخت کی طرف لے جاتا ہے۔

محسن بھوپالی کا دوسرا شعری مجموعہ جس میں غزلیں موجود ہیں "ماجرا" ہے جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔ پہلا مجموعہ شکست شب ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا اس اعتبار سے دیکھا جائے تو محسن کی یہ غزلیں ان کے بیس برس کی کاوشوں کا حاصل ہیں۔ اس دوران محسن بھوپالی کے دو شعری مجموعے اور بھی شائع ہوئے لیکن ان میں سے ایک جستہ جستہ خالص قطعات پر مشتمل تھا جب کہ دوسرا مجموعہ "نظمانے" صرف نظمانوں کا مجموعہ تھا۔ اس طرح یہ مجموعہ تقریباً بیس سال کی غزلوں پر مبنی ہے۔ اس مجموعے میں کچھ متفرق اشعار اور کچھ ایک ہی بحر کے دو یا تین اشعار کے علاوہ تقریباً پچاس پچپن غزلیں ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دوران محسن بھوپالی نے اوسطاً سال میں دو یا تین غزلیں ہی کہی ہیں۔

اس سے دو نتائج نکالے جا سکتے ہیں اول یہ کہ ان کی دلچسپی ہیئتی تجربوں میں زیادہ رہی اور غزل میں ہیئتی تجربات کی گنجائش بہت کم ہے اس لیے غزلیں کم کہیں۔ ایک نتیجہ یہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ اس دوران پاکستان کے حالات کافی ہنگامی رہے، اسی دوران پاکستان ایک اور تقسیم سے گزرا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش نام کے نئے ملک کی صورت میں ابھرا۔ فوجی حکومتوں کا سلسلہ اس دوران بھی جاری رہا۔ شاید ایسے حالات میں غزلوں کے لیے جگہ کم تھی۔ پھر اس کی ایک توضیح یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ قطعہ غزل کے بہت قریب صنف سخن ہے اس لے بہت سے غزل کے اشعار قطعہ میں تبدیل ہو گئے ہوں گے۔ بحرحال جب بیس برس بعد ان کی غزلیں شائع ہوئیں تو ان غزلوں کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف میں محسن بھوپالی نے بے

تو جہی نہیں کی تھی بلکہ غزل کی صنف پر زیادہ غور وفکر کیا تھا اور زیاد مطالعہ اور مشاہدہ کیا تھا۔ اس لیے اب جو محسن بھوپالی کی غزلیں شائع ہوئیں تو ان میں زیادہ گہرائی اور گیرائی نظر آئی۔

اس مجموعے ''ماجرا'' کے پیش لفظ ''اپنی بات'' میں خود محسن بھوپالی لکھتے ہیں۔

> ''زیر نظر مجموعہ بیس اکیس برسوں میں کہی گئی نظموں اور غزلوں کا انتخاب ہے۔ ماجرا کی تخلیقات احساس کی ایک خاص سطح کی متقاضی ہیں۔ یہ مجموعہ شعر اور شعور کے حوالے سے اپنی ذات اور گرد وپیش کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے گزشتہ دو دہائیوں کا ماجرا ہے جس کے ہم سب کردار بھی ہیں اور دیکھنے اور سننے والے بھی ہیں۔ مجھے بس یہی ایک بات کہنی تھی۔'' ۳۶

تو اس طرح شاعر خود اعتراف کرتا ہے کہ یہ جو شاعری ہے ایک طرح سے بیس اکیس سال کی روداد ہے۔ اس مجموعے کا آغاز جس شعر سے ہوتا ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ شاعر اپنے منصب سے بخوبی واقف ہے۔ شعر اس طرح ہے۔

ہماری جان پہ دوہرا عذاب ہے محسن
کہ دیکھنا ہی نہیں ہم کو سوچنا بھی ہے

اسے معلوم ہے کہ شاعر ہونے کی وجہ اسے زمانے میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے نہ صرف دیکھنا ہے اور نبرد آزما ہونا ہے۔ بلکہ ان تمام مسائل کے حل کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔

ملک وقوم میں سماجی، سیاسی اور سب سے بڑھ کر تہذیبی زندگی میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس سب پر محسن بھوپالی نے خاص غزل کے انداز میں ردعمل ظاہر کیا ہے، اقدار کی شکست و ریخت بھی اس مجموعے میں ایک اہم سوال ہے۔ ماجرا کی شاعری اپنے عہد کا آئینہ ہے۔ ان حالات کا اظہار کبھی بہت شدید اور براہ راست ہے تو کبھی آہستگی سے استعاروں اور علامتوں کے پردے میں چھپا۔

خموش رہتے ہوئے بھی افسانہ کہہ دینا
وہ ایک لمحے میں حال زمانہ کہہ دینا

میں نے جس طرح زیست کاٹی ہے
ایک دن ہی سہی بسر تو کر

ہم کو مجبوریاں گناتے ہیں
کب جتایا ہے اختیار میاں

بے زمینی کا دکھ ہمیں بھی ہے
کیوں جتاتے ہو بار بار میاں

اپنے لٹ جانے کا الزام کسی کو کیا دوں
میں ہی تھا راہنما میں ہی تھا راہزن اپنا

جو کبھی پیدا ہوئی تھی خواب سے
وہ حقیقت خواب ہو کر رہ گئی

تری اقبال مندی مبارک تجھے
ہاں مگر عمر کو جاوداں مت سمجھ

محفوظ خود کو کرتے ہیں لفظوں کے خول میں
جو لوگ حق پسند ہیں، حق بولتے نہیں

محسن بھوپالی ہندستان کے شہر بھوپال سے ہجرت کر کے پاکستان گئے تھے، یوں تو وہ شعوری طور پر پاکستان کے حامی تھے، پاکستان کو مسلمانوں کے خوابوں کی تعبیر سمجھتے تھے۔ لیکن ایک عرصہ پاکستان میں گزارنے کے بعد جب پاکستان ان کے خوابوں کا ملک نہ بن سکا بلکہ چند بڑے سرداروں، سیاست دانوں اور افسران کو چھوڑ کر کسی کے خوابوں کا پاکستان نہ بن سکا۔ تو انھیں خوابوں کی شکست کا احساس تو ہوا ہی ہوگا۔ اگر چہ ان کی شاعری میں کہیں بھی پاکستان کا تجربہ ایک ناکام تجربہ کے طور پر نہیں ابھرا لیکن جذباتی طور پر کبھی کبھی وطن سے دوری کا احساس ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ہجرت کا درد براہِ راست نہ سہی لیکن گزرے وقت کی یادوں سے مکمل پیچھا چھڑانا ممکن بھی نہیں۔ وہ بھی ایک حساس شاعری کے لیے تو اور بھی ناممکن ہے۔ ان کے کئی اشعار میں اس کی بڑی خوبصورت عکاسی ہے۔ یہ درد ان تمام مہاجروں کے دل کا آئینہ بن جاتا ہے جو ایک بہتر حیات کا خواب لے کر پاکستان گئے تھے، وہ وطن سے دور بھی ہو گئے اور ان کے خوابوں کا پاکستان مل بھی نہ سکا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تا دیر ہم بدیدۂ تر دیکھتے رہے
یادیں تھیں جس میں دفن وہ گھر دیکھتے رہے

میں نے رکھی بنائے کون و مکاں
کیا قیامت ہے بے اساس ہوں میں

در و دیوار سے نکل کر لوگ
فکرِ دیوار و در میں رہتے ہیں لوگ

ذکر وطن میں محو ہیں فکر وطن سے دور
الجھا رہے ہیں بات گرہ کھولتے نہیں

محسن بھوپالی اس معنی میں سچے ترقی پسند ہیں کہ ان کے یہا مایوسی کہیں نظر نہیں آتی، حالات لاکھ خراب سہی لیکن کوئی نہ کوئی مثبت پہلو اور امید کی کوئی کرن تلاش ہی کر لیتے ہیں۔ ان کے یہاں ہر اندھیرے میں کوئی نہ کوئی چراغ روشن پائیں گے۔ ہر بار یہی لگتا رہا کہ آج کے حالات کچھ خراب سہی، لیکن حالات تبدیل ہوں گے۔ اتنے بڑے عوام کو کوئی کب تک بہلا سکتا ہے کبھی تو لوگوں میں شعور آئے گا۔ اور انھیں صحیح نمائندہ ملیں گے۔ جو وطن کو صحیح راہ پر لے جائیں گے۔ وہ ہر اک خرابی میں کوئی نہ کوئی مثبت پہلو نکال لیتے ہیں اور اسی کے سہارے زندگی اور بہتر مستقبل کے خواب سجاتے رہے۔

زندگی گل ہے نغمہ ہے ماہتاب ہے
زندگی کو فقط امتحاں مت سمجھ

مایوس نہیں ہوں روشِ وقت سے محسن
دیوار سے بڑھ جاتا ہے دیوار کا سایا

فضا خموش ہوئی تو زمین بولے گی
کہ جستجو کا کہیں سلسلہ رکا بھی ہے

ہماری جان پہ دہرا عذاب ہے محسن
کہ دیکھنا ہی نہیں ہم کو سوچنا بھی ہے

تصویرِ دشت میں یہ کمال ہنر بھی ہے
دھندلا سا اک تصورِ دیوار و در بھی ہے

یہ میرے چاروں طرف کس لیے اجالا ہے
ترا خیال ہے یا دن نکلنے والا ہے

محسن بھوپالی کا اگلا شعری مجموعہ ''گردِ مسافت'' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا، اس میں ۲۶ غزلیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ہی زمین میں دو دو شعر تین جگہ درج ہیں جب کہ ایک متفرق شعر بھی درج ہے۔ اس طرح کل ۷ متفرق اشعار ہیں جو مکمل غزلوں کے علاوہ ہیں۔ اس دوران بھی ایک سال میں تقریباً چار غزلوں کا اوسط آتا ہے۔ اس طرح محسن بھوپالی نے غزل کو نظر انداز بھی نہیں کیا ہے اور غزلوں کو انبار بھی نہیں لگایا ہے۔ اس مجموعے کے پیش لفظ ''حرفِ اظہار'' میں وہ اپنی فکر و فن پر لکھتے ہیں۔

''یہ موڑ اظہار صداقت۔ نظریۂ فن۔ اور پندارِ فکر کے آئینہ دار ہیں کہ شعری سطح پر اظہارِ صداقت کے جذبے نے میرے نظریۂ فن کو جلا بخشی ہے اور نظریۂ فن نے پندارِ فکر کا سرمایہ عطا کیا ہے۔'' ۳۷؎

محسن بھوپالی کے یہاں گردِ مسافت کے شائع ہونے تک اظہار صداقت اور نظریۂ فن میں ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس سے قبل کی شاعری میں کہیں نہ کہیں پیغام اور خارجی حقیقت نگاری کا عمل دخل جاتا تھا لیکن گردِ مسافت میں دونوں کے درمیان پہلے سے کہیں زیادہ توازن نظر آتا ہے۔ گردِ مسافت میں ایک رجحان اور بھی صاف نظر آتا ہے۔ وہ براہ راست اظہار خیال سے گریز کا ہے۔ ساتھ ہی وہ یہاں ذات اور وجود کے کوائف بھی بیان کر رہے ہیں۔ اس سے قبل کی ان کی شاعری میں یہ چیزیں بہت کم تھیں۔ ان میں خارجی سطح پر جو ہو رہا ہے اس کی تو عکاسی نظر آتی تھی اور بہت خوب نظر آتی تھی۔ لیکن داخل میں کیا ہو رہا ہے اس کی آواز بہت کم سنائی پڑتی تھی۔ پھر زندگی کے بارے میں وہ کیا سوچتے ہیں اور ان کا نظریۂ فن کیا ہے اس کے بارے میں بہت کم معلوم ہوتا ہے لیکن اس مجموعہ میں ان کے یہاں ایک خوشگوار تبدیلی نظر آتی ہے جو نظر کی گہرائی اور گیرائی سے پیدا ہوتی ہے وہ ان غزلوں میں محسوس ہو ہوتی ہے۔ محسن بھوپالی نے گردِ مسافت کے حرف اظہار میں اس مجموعے کے ایک شعر کو اپنی شاعری کا تیسرا موڑ قرار دیا ہے۔ وہ شعر اس طرح ہے۔

تمھیں آسائشِ منزل مبارک
ہمیں گردِ مسافت ہی بہت ہے

یہ شعر ایک سیاسی شعر ہے اور اپنے عہد کے حکم رانوں کو کھلی چنوتی ہے۔ یہ شعر ایک طرح سے محکوموں کی طرف سے حکمرانوں کے لیے چنوتی ہے لیکن یہ شعر پاکستان کی سیاست کی عکاسی ہے کہ اس ملک میں عوام کو گرد مسافت کے علاوہ کچھ خاص نہیں ملا جب کہ حکمرانوں کے لیے اسی غریب پاکستان میں آسائشوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ محسن بھوپالی کے یہاں سیاسی صورت حال پر شعر کہنے کا عمل جو شروع سے تھا اس مجموعے بھی جاری وساری رہا لیکن اس مجموعے میں ان کا فلک زیادہ وسیع نظر آتا ہے اور وہ کچھ نئے مضامین کو بھی شعر کے قالب میں ڈھالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا تجربہ بڑا ہی خوش آہنگ ہے، ان میں ذاتی اور داخلی احساسات بھی نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی اس میں تنہائی کا سوال بھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عمرِ مصروف کوئی لمحۂ فرصت ہو عطا
میں کبھی خود کو میسر نہیں ہونے پاتا

وہ ساتھ لے گیا قول و قرار کا موسم
تمام عمر ہے اب انتظار کا موسم

بات بین السطور ہوتی ہے
شعر میں حاشیے نہیں ہوتے

صحرا نوردیوں نے دیا ہے وہ حوصلہ
ذکرِ بہار دامنِ پرِ خار پر لکھا

یوں ہی تو شاخ سے پتے گرا نہیں کرتے
بچھڑ کے لوگ زیادہ جیا نہیں کرتے

اب کے موسم میں یہ معیار جنوں ٹھہرا ہے
سر سلامت رہیں دستار نہ رہنے پائے

بدن تو جل گئے سائے بچائے ہم نے
جہاں بھی دھوپ ملی گھر بنا لیے ہم نے

اپنا آپ تماشا کر کے دیکھوں گا
خود سے خود کو منہا کر کے دیکھوں گا

بچھڑ کے تجھ سے میسر ہوئے وصال کے دن
ہیں تیرے خواب کی راتیں، ترے خیال کے دن

ہر اک عمل کا وہ کیا کیا جواز رکھتا ہے
نہ بن پڑے گا جواب ایک بھی سوال کے دن
گزر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی میری
سفر میں جیسے رہے کوئی گرد باد کے ساتھ

ایک مدت کی سلگتی ہوئی تنہائی نہ ہو
وہ لرزتا ہوا سایہ سا لبِ جو کیا ہے

محسن بھوپالی کے یہاں اب تک کے مجموعوں میں عشقیہ شاعری اگرچہ بالکل نایاب تو نہیں تھی مگر کمیاب ضرور تھی۔ لیکن اس مجموعے میں ایک خوش گوار تبدیلی یہ بھی نظر آتی ہے کہ اردو شاعری کے سب سے محبوب موضوع پر بھی اس مجموعے میں اشعار نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ عشقیہ شاعری محسن بھوپالی کے یہاں رسمی نہیں ہے بلکہ اس میں گہرے وجدان اور تجزیہ کی رمق پائی جاتی ہے۔

ہونا بھی چاہیے تھا اسے میرے روبرو
وہ شخص ہی تو میرے کبھی آس پاس تھا

وہ شرر ہے کہ ستارا ہے کہ جگنو، کیا ہے
اس سے مل کر یہ یقیں آیا کہ جادو کیا ہے

دخل ہوتا ہے کچھ نظر کو بھی
دلکشی بے سبب نہیں ہوتی
کیا کسی کے ہو منتظر محسن
بے کلی بے سبب نہیں ہوتی
مدت گزری اک وعدے پر آج بھی قائم ہیں محسن
ہم نے ساری عمر نباہی اپنی پہلی مجبوری
ہمارے عہد سے تم کوہکن تک اک نظر ڈالو
یہ کارِ عشق ہے اس میں محنتانہ نہیں ملتا
کیا خبر تھی ہمیں یہ زخم بھی کھانا ہوگا
تو نہیں ہوگا تری بزم میں آنا ہوگا

اس کے بعد ۱۹۹۲ء میں محسن بھوپالی کا اس وقت تک کے شعری کلام کا کلیات مجموعۂ سخن کے نام سے شائع ہوا۔ چونکہ اس میں کوئی الگ سے شاعری شائع نہیں ہوئی تھی وہی شاعری تھی جو مختلف مجموعوں میں شائع ہو چکی تھی اس لیے اس مجموعے پر الگ سے بات کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اس کے بعد ۱۹۹۳ء میں موضوعاتی نظمیں شائع ہوئیں جو عنوان سے ظاہر ہے کہ صرف نظمیں ہی تھیں۔

اس کے بعد محسن بھوپالی کا ۱۹۹۶ء میں شعری مجموعہ 'روشنی تو دیے کے اندر ہے' شائع ہوا اس میں دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی تھیں۔ پچھلے مجموعے کے تقریباً آٹھ سال بعد شائع ہونے والے اس مجموعے میں ۳۰ غزلیں ہیں۔ اس سے

ظاہر ہے کہ محسن بھوپالی کی غزل کہنے کی رفتار اب بھی تقریباً وہی ہے۔ جو اس سے پہلے کے مجموعے کے وقت تھی۔ اس مجموعے کا آغاز اس شعر کے ساتھ ہوتا ہے۔

کیا خبر لو بجھانے والے کو
روشنی تو دیے کے اندر ہے

اس شعر میں لو بجھانے والے سے مراد وہ بانکے ہیں جو حکومت کے تمام ظلم و ستم کے باوجود اس کے خلاف لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور حکومت انھیں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینا چاہتی ہے لیکن حکومت اس بات کو نظر انداز کر دیتی ہے کہ روشنی تو دراصل دیے کے اندر ہی ہوتی ہے۔ اصل میں لو وہ میں نہیں ہوتی ہے اس لیے وہ دوبارہ پھر لو جلنے لگتی ہے۔ اس سے شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ احتجاج کرنے والے در اصل اپنی فکر کی وجہ سے حکومت کے ظلم و ستم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اگر وہ کسی شخص کو خاموش بھی کر دیتی ہے یا ختم بھی کروا دیتی ہے تو بھی وہ فکر ختم ہونے والی نہیں ہے جس فکر سے ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں جو ظلم و ستم کے خلاف لڑنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ سیاسی حالات پر چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

عہدِ آمر میں تھا حق گوئی سے عذر
دورِ جمہور ہے اب تو لکھیے

ابھی کچھ اور بھی گرد و غبار ابھرے گا
پھر اس کے بعد مرا شہسوار ابھرے گا
شبِ سیہ کا مقدر شکست ہے محسن
درِ افق سے پھر انجم شکار ابھرے گا

آنکھیں پھیرنے والو یہ بھی سوچا ہے
ڈوبتے وقت بھی سورج سورج رہتا ہے

دریا پہ نہ پہنچا تھا تو دریا بھی بہت تھا
اب سوچ رہا ہوں کہ سمندر مجھے مل جائے

بے خبر تھا میں ایک مدت سے
گھر کے اندر بھی ایک دنیا ہے

کھلی کتاب کی مانند تھا جو میرے لیے
وہ کہہ رہا ہے تمہیں بے نقاب کر دوں گا

وہ جانتا ہے اسے کیا بتائیں دل کا حال
دعا کو ہاتھ اٹھانا عجیب لگتا ہے

جاتے ہوئے ایک نظر کر گیا
قتل کوئی دل کا نگر کر گیا

ہماری نسل بزرگوں کے سامنے چپ تھی
یہ نسل نو ہے، یہ سارے جواب مانگتی ہے

تسلط کی کشاکش میں بالآخر
یہ چشمہ خار و خس سے پٹ گیا ہے

ان اشعار سے محسن بھوپالی کی غزلوں کا عام لہجہ سمجھ میں آتا ہے ان میں ایک طرح کی علامت نگاری بھی ہے، سیاسی سماجی سچائی بھی ہے۔ غزل کی روایت بھی ہے جس میں استعارہ سازی بھی ہے روایت سے واقفیت کے ساتھ نئے زمانے کا آہنگ بھی ہے۔ محسن بھوپالی دوسری شعری اصناف کی طرح یہاں بھی سیاسی احتجاج بخوبی

ابھر کر آیا ہے۔

''منزل'' محسن بھوپالی کا ایسا آخری شعری مجموعہ تھا جس میں غزلیں تھیں یہ مجموعہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ اگر چہ محسن بھوپالی کے اشعار کی ایک کتاب اس کے بعد بھی شائع ہوئی۔ جس کا نام ''محسن بھوپالی کے سو شعر'' تھا۔ اس میں ان کے ۱۰۰ منتخب اشعار تھے جو مختلف غزلوں سے انتخاب کیے گئے تھے۔ اس لیے اسے باضابطہ غزلوں کا مجموعہ نہیں کہہ سکتے۔ ''منزل'' کے سرِ ورق کے بعد پہلے صفحہ پر ایک شعر ہے جو ایک طرح سے شاعر کا سب سے پسندیدہ شعر ہے اور اسے مجموعے کے بارے میں شاعر کا بیان بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ شعر اس طرح ہے۔

میں یہاں آیا تھا لے کر صبح کی پہلی کرن
تم نے مجھ کو ڈوبتے سورج کے منظر میں دیکھا

اس شعر میں دنیا سے شکایت ہے کہ وہ صبح کی پہلی کرن کی طرح ایک نیا پیغام لے کر آیا تھا جس میں نئی روشنی تھی دنیا کو سمجھنے کے لیے اور زندگی کرنے کے لیے۔ لیکن تم لوگوں نے مجھے شام کے ڈوبتے سورج کی طرح دیکھا جو ایک خوبصورت منظر کی تخلیق تو کر سکتا ہے لیکن اس میں زندگی کرنے کے لیے ضروری گرمی اور روشنی نہیں ہوتی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کمی ہوتی ہے کہ ڈوبتے سورج کی روشنی چند لمحوں کے لیے ہوتی ہے، کوئی اس کے سہارے مستقبل کا کوئی خواب نہیں بن سکتا۔ اس شعر میں ایک شکایت یہ بھی ہے کہ آپ لوگوں نے میرے شعروں کی داد تو خوب دی جیسے شام کے خوبصورت منظر کو دیکھ کر لوگ خوش ہوتے ہیں لیکن اس سے کوئی پیغام نہیں لیتے ہیں ایسے ہی دنیا نے میری شاعری کی داد تو دی لیکن اس میں جو پیغام تھا لوگوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔

اس مجموعے میں تقریباً ۴۵ غزلیں ہیں جو غزلوں کے پچھلے مجموعے کے تقریباً سات سال بعد شائع ہوا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اس بار غزل کہنے کی رفتار نسبتاً کچھ زیادہ ہے۔ اب وہ انجینئرنگ کے پیشہ سے سبکدوش بھی ہو چکے تھے اور ان کی عمر تقریباً ۷۰ سال ہو چکی تھی۔ آپریشن کے بعد گلا بھی پوری طرح ساتھ نہیں دیتا تھا اور

مشین کے سہارے تھوڑا بول پاتے تھے بس۔ اس لیے مشاعروں میں جانے اور سفر کا سلسلہ بھی بہت کم وہ چکا تھا۔ اس لیے گھر میں بیٹھے بیٹھے ایک شاعر اگر شاعری نہ کرے تو کیا کرے؟ لیکن ان غزلوں کی تعداد پھر بھی ایسی زیادہ نہیں ہے کہ اسے زود گوئی کہا جائے۔ عمر کے اس آخر ایام میں محسن بھوپالی کی شاعری میں کہیں کہیں زندگی کا ایک خوبصورت احتساب بھی نظر آتا ہے ایسے میں وہ ہمیشہ بڑے پر اطمینان نظر آتے ہیں کہ دنیا داری میں پڑ کر انھوں نے کبھی مفاہمت نہیں کی۔ اگر چہ سیاسی اور سماجی جوش و جذبہ کی دھمک اب بھی اشعار میں سنائی دیتی ہے۔ وہ سیاسی ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کرنا ہر اہل دانش وادراک کی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے تھے اور جب وہ اپنی ذمہ داری سے منہ پھیرتے ہیں تو یہ بات ان کو نا قابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

کیا ضروری ہے اب یہ بتانا مرا
ٹوٹتی شاخ پر تھا ٹھکانا مرا
غم نہیں اب ملی ہیں تنہائیاں
انجمن انجمن تھا فسانہ مرا

سیر دنیا سے پلٹ کر جب قدم گھر میں رکھا
دیر تک خود کو حصارِ روزن و در میں رکھا
سانحے کیا کیا نہ گزرے وقت ہے لیکن گواہ
ہم نے کب نقدِ سخن کو کاسۂ زر میں رکھا

زمیں شاداب کرتا جا رہا ہوں
لہو سے رنگ بھرتا جا رہا ہوں
شکوہ نہیں ہے اہل سیاست جو چپ رہے
یہ غم ہے اہل دانش و ادراک سو گئے

شاعر کو اپنے آبائی وطن بھوپال کی اس مجموعے میں پھر یاد ستاتی ہے۔ کیونکہ لوگ اب بھی انھیں باہری ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے شعوری فیصلے پر کفِ افسوس بھی نہیں ملتے۔ بلکہ اپنے آپ کو اس نئے ملک کے بسانے والوں میں شمار کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔

بے زمینی کا ملتا ہے طعنہ مجھے
جرم ٹھہرا ہے بستی بسانا مرا
ارض بھوپال سے تھا تعلق کبھی
اب تو سب کچھ ہے لاڑکانہ مرا

بہت چاہا تھا ہم نے بام و در سے رابطہ رکھنا
مقدر میں ہی تھا گردِ سفر سے رابطہ رکھنا
جواں جذبوں کو یہ بوڑھی نصیحت یاد کب ہوگی
کہیں بھی جاؤ لیکن اپنے گھر سے رابطہ رکھنا

اس مجموعے میں کچھ ایسے اشعار بھی ہیں جن میں زندگی کی ناپائے داری اور ایک گہری فلسفیانہ فکر بھی نمایاں ہے۔ ان میں اردو شاعری کی ایک توانا آہنگ یعنی تصوف کی باریکیاں بھی ملتی ہیں۔ زندگی کیا ہے؟ ہم اس دنیا میں کس لیے آئے اور کیوں آئے؟ اور اس دنیا کا حاصل کیا ہے؟ یہ سنجیدہ سوال بھی ان اشعار میں پیش آئے ہیں۔

تماشہ گاہِ ہست و بود ہے دنیا خرد مند
مناظر میں نہ کھو جانا، نظر سے رابطہ رکھنا

☆

اب دل میں تمنا ہے نہ خواہش کوئی باقی
اک طائرِ جاں خانۂ بے در میں بچا ہے

☆

دائم آباد ہے جو کون و مکاں سے باہر
اک جہاں اور ہے زندانِ جہاں سے باہر

''محسن بھوپالی کے سوشعر'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ کتاب محسن بھوپالی کی تمام غزلوں کے منتخب اشعار پر مبنی ہے۔ اس میں کچھ اشعار دوسری اصناف خاص طور سے قطعات سے بھی لیے گئے ہیں۔ لیکن بیشتر ان کی غزلوں سے ہی ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے اشعار ہیں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس کتاب کا آغاز ان کی نظم ''دوراندیشی'' سے ہوا ہے اور اختتام ایک نظم ''تسلسل ٹوٹ جائے گا'' سے ہوا ہے۔ ان دونوں نظموں کے درمیان سو منتخب اشعار درج ہیں۔ ان دونوں نظموں کا تفصیلی ذکر اور ان کی خوبیوں کا تجزیہ نظموں کے مطالعہ کے وقت کیا جا چکا ہے۔ اس لیے ان دونوں نظموں پر پھر سے گفتگو کرنے کا اب کوئی جواز نہیں بنتا ہے۔

ان منتخب اشعار کے مطالعے سے محسن بھوپالی کی غزل گوئی کا مکمل مطالعہ تو نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کی غزل گوئی کی کوئی صحیح تصویر بنائی جا سکتی ہے لیکن یہ اشعار ان کے نمائندہ رجحانات کا سراغ ضرور دے سکتے ہیں۔ چونکہ ان اشعار میں یہ نہیں دیا گیا ہے کہ کون سا شعر کس مجموعے سے ہے؟ اور کس سال میں کہا گیا ہے؟ اس لیے محسن بھوپالی کی غزل گوئی میں ابتداء سے انتہا تک کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے یا نہیں؟ اس کا بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ محسن بھوپالی عام طور پر ہر مجموعے میں عرض مصنف یا پیش لفظ وغیرہ ضرور لکھتے تھے لیکن اس انتخاب میں کوئی پیش لفظ وغیرہ بھی نہیں ہے۔ ان اشعار کو کس بنیاد پر منتخب کیا گیا ہے؟ شاعر نے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔ لیکن ان کے مطالعے سے یہ بات کہیں نہ کہیں محسوس ہوتی ہے کہ ان اشعار کے انتخاب میں کہیں نہ کہیں مقبولیت کا پیمانہ کام کر رہا ہے۔ جو اشعار زیادہ مقبول ہوئے ان کو اس میں جگہ دی گئی ہے۔ محسن بھوپالی کے اس انتخاب میں کچھ ایسے بہترین اشعار موجود نہیں ہیں جو اشعار تو بہت اچھے تھے لیکن کسی وجہ سے انھیں مقبولیت نہ مل سکی۔ جب کہ کچھ ایسے کمزور شعر بھی ہیں جو بہت اچھے نہ سہی لیکن انھیں مقبولیت

کافی حاصل ہوئی۔ چونکہ محسن بھوپالی مشاعروں کے بہت مقبول شاعر تھے اس لیے ان کا یہ انتخاب کہیں نہ کہیں مقبولیت سے متاثر ہے۔ یہاں بس چند ایسے اشعار کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کا دیگر مجموعوں کے مطالعہ کے ساتھ اوپر ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

تاریخ ہر اک موڑ پہ دیتی ہے گواہی
قدرت کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے

پرندوں کو نہ پتھر سے اڑاؤ
مسافر ہیں ٹھکانا چاہتے ہیں

محسن بھوپالی کی شاعری کا مجموعی طور سے جائزہ لیا جائے تو ان کی غزلوں کے چند نمائندہ رجحان سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کی غزل گوئی کی پہلی اور شاید سب سے بنیادی شناخت ان کا سیاسی وسماجی شعور ہے، وہ حالات اور عصری صورت حال پر غیر معمولی طور پر غزل کی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو ردعمل پیش کرتے ہیں وہ انھیں اردو غزل کی روایت میں ایک مختلف مقام عطا کرتا ہے۔ جن موضوعات پر دوسرے شعرا غزل کے شعر کہنے سے گریز کرتے ہیں وہ ان موضوعات پر غزل کی زبان میں بڑے اعتماد کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ عصری صورت حال وواقعات پر برجستگی کے ساتھ اور غزل کی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے شعر کہا جائے۔

محسن بھوپالی کی غزل کی ایک اور اہم صفت یہ ہے کہ ان کی شاعری میں غزل تغزل اور لہجے کی گھلاوٹ پورے آب وتاب کے ساتھ پائی جاتی ہے ان کا لہجہ کبھی بھی بدآہنگ نہیں ہونے پاتا ہے۔ وہ نئی نئی تراکیب کی تخلیق کرتے ہیں ان میں نئے معنی پیدا کرتے ہیں لیکن ان کا آہنگ کبھی بگڑنے نہیں پاتا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں بات کو اس ادا کے ساتھ کہہ جاتے ہیں کہ بات سیدھے دل میں اتر جاتی ہے۔ ان کی کفایت لفظی کے بارے میں نزہت انیس لکھتی ہیں۔

''اور یہ اختصار اور برجستہ گوئی دوسری اصناف کی طرح آپ کی

کافی حاصل ہوئی۔ چونکہ محسن بھوپالی مشاعروں کے بہت مقبول شاعر تھے اس لیے ان کا یہ انتخاب کہیں نہ کہیں مقبولیت سے متاثر ہے۔ یہاں بس چند ایسے اشعار کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کا دیگر مجموعوں کے مطالعہ کے ساتھ اوپر ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

تاریخ ہر اک موڑ پہ دیتی ہے گواہی
قدرت کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے

پرندوں کو نہ پتھر سے اڑاؤ
مسافر ہیں ٹھکانا چاہتے ہیں

محسن بھوپالی کی شاعری کا مجموعی طور سے جائزہ لیا جائے تو ان کی غزلوں کے چند نمائندہ رجحان سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کی غزل گوئی کی پہلی اور شاید سب سے بنیادی شناخت ان کا سیاسی و سماجی شعور ہے، وہ حالات اور عصری صورت حال پر غیر معمولی طور پر غزل کی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو ردعمل پیش کرتے ہیں وہ انھیں اردو غزل کی روایت میں ایک مختلف مقام عطا کرتا ہے۔ جن موضوعات پر دوسرے شعرا غزل کے شعر کہنے سے گریز کرتے ہیں وہ ان موضوعات پر غزل کی زبان میں بڑے اعتماد کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ عصری صورت حال و واقعات پر برجستگی کے ساتھ اور غزل کی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے شعر کہا جائے۔

محسن بھوپالی کی غزل کی ایک اور اہم صفت یہ ہے کہ ان کی شاعری میں غزل تغزل اور لہجے کی گھلاوٹ پورے آب و تاب کے ساتھ پائی جاتی ہے ان کا لہجہ کبھی بھی بدآہنگ نہیں ہونے پاتا ہے۔ وہ نئی نئی تراکیب کی تخلیق کرتے ہیں ان میں نئے معنی پیدا کرتے ہیں لیکن ان کا آہنگ کبھی بگڑنے نہیں پاتا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں بات کو اس ادا کے ساتھ کہہ جاتے ہیں کہ بات سیدھے دل میں اتر جاتی ہے۔ ان کی کفایت لفظی کے بارے میں نزہت انیس لکھتی ہیں۔

''اور یہ اختصار اور برجستہ گوئی دوسری اصناف کی طرح آپ کی

غزلوں کی بھی نمایاں خوبی ہے۔آپ کم الفاظ میں زیادہ بات کہنے
کے فن سے واقف ہیں ار الفاظ کو صحیح اور بر وقت استعمال کرنا
جانتے ہیں۔''۳۸

محسن بھوپالی کے یہاں غزل کی کفایت لفظی خوب پائی جاتی ہے۔سحر انصاری نے محسن بھوپالی کی غزل گوئی کے بارے میں لکھا ہے۔

''غزل اس وقت اپنا جادو جگاتی ہے۔ جب اس میں ضبط اور بے
ساختگی کے عناصر یک جا ہو جائیں کہیں کہیں۔محسن کے اشعار میں یہ
جادو نظر آتا ہے۔غزل میں اگرچہ وہ رنگ جسے ''حرف با زناں گفتن''
سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کے یہاں خال خال ہی ہے لیکن تجربۂ
حیات کے دوسرے رنگ جو آج کے انسان کے لیے خصوصا تیسری دنیا
کے باشندوں کے لیے زیادہ اہم ہیں، ان کی غزل میں ایک خاص
آہنگ کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں۔انھوں نے گرد و پیش کی زندگی کے
حقائق کو بڑی خوبصورتی سے اپنی شاعری میں سمویا ہے۔''۳۹

یہ بات صحیح ہے کہ محسن بھوپالی کی شاعری میں ''حرف با زناں گفتن''یعنی محبوب سے یا محبوب کی گفتگو بہت خال خال ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس کا بالکل ذکر نہ ہو۔ان کی غزل جس کا شعر ہے''چاہت میں کیا دنیاداری عشق میں کیسی مجبوری'' جسے گل بہار بانو نے بہت ہی خوبصورت انداز میں گایا ہے بہت مقبول ہے۔محسن کی شاعری غزل کی دیگر خوبیوں سے بھری ہوئی ہے۔اور ان کی شاعری میں تیسری دنیا کے لوگوں کی زندگی کی تمام حقیقتیں بہت ہی بے لاگ طریقے سے بیان ہوئی ہیں۔

محسن بھوپالی کے غزلوں کی ایک نمایاں صفت یہ بھی ہے کہ ان میں طنز خاص طور سے سیاسی اور اخلاقی طنز بہت گہرا ہے۔ یہ طنز دیگر اصناف میں تو عام بات ہے لیکن غزل کی روایت کو نبھاتے ہوئے بیشتر اور کبھی کبھی مزاح کی صورت پیدا کر دینا خاص محسن بھوپالی کا کارنامہ ہے جسے اردو غزل میں ان کی الگ شناخت بنتی ہے۔

(۳) نظمانے

(نظم و افسانے کے امتزاج کی حاصل ایک نئی صنف)

ہر تخلیق کار اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں موضوع اور ہیئت کے ساتھ تجربہ کرتا رہتا ہے۔ اسے جب جب لگتا ہے کہ وہ اپنی بات کو جس طرح سے کہنا چاہ رہا ہے اور جس بات کو کہنا چاہ رہا ہے موجودہ ہیئت و اصناف میں ان کے ساتھ انصاف نہیں ہو پا رہا ہے۔ تو وہ کچھ نئے تجربات کو بیان کرنے کے لیے نئی ہیئت و صنف ایجاد کرنے کو بے چین رہتا ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی سانچے میں محبوث محسوس کرتا ہے لیکن اسے یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ کیا نیا کرنا یا کہنا چاہ رہا ہے اور پھر ایک دن اچانک اسے الہام ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح کا ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا ہے اور پھر وہ اس کو تخلیقی رنگ دے دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی محسن بھوپالی کے ساتھ ہوا۔

اردو میں کچھ منظوم افسانے پہلے بھی لکھے گئے ہیں۔ لیکن محسن بھوپالی نے اسے ایک شعوری عمل کے طور پر گرد و پیش کے واقعات کو مختصر لیکن منظوم شکل میں پیش کیا جائے۔ محسن بھوپالی کے یہاں یہ عمل نظموں اور قطعات میں ہی نہیں بلکہ غزل میں بھی کسی نہ کسی طور پر پہلے سے موجود تھا۔ اس سلسلے میں سحر انصاری رقم طراز ہیں۔

> ''منظوم افسانے اردو میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ افسانے مختصر بھی رہے ہیں اور طویل بھی۔ پھر افسانے کی قید سے قطعہ نظر بعض بیانیہ اور واقعاتی نظمیں بھی اپنی جگہ ایک قسم کی منظوم کہانی یا منظوم افسانہ ہی ہوتی ہیں۔ لیکن جب محسن نے چند مختصر منظوم افسانے بالالتزام لکھ لیے تو مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا تجربہ ایک خاص مزاج و ترکیب کی ایک نئی صنف سخن کو جنم دے رہا ہے۔''[۴۰]

محسن بھوپالی کی یہ نئی قسم کی شاعری ۱۹۶۲ء میں شائع ہونا شروع ہوئی سب سے

پہلا نظمانہ ''دوروپ'' ماہنامہ افکار ستمبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کئی نظمانے مثلاً ''معمول''، ''دوسرا شکار'' اور ''مشورہ'' ۱۹۶۶ء تک شائع ہوئے جنھیں بعد میں ان کے نظمانے کے مجموعے میں بھی شامل ہوئے، اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا۔ اگر چہ اس وقت تک اس نئی صنف سخن کا نام طے نہیں ہوا تھا۔ شروع میں محسن بھوپالی نے اسے منظوم افسانچہ کا نام دیا لیکن خود انھیں اور ان کے ساتھیوں کو منظوم افسانچے کا صوتی اور معنوی آہنگ متاثر نہ کر سکا۔ اس کے بعد احمد ندیم قاسمی نے کہا کہ جب تک اس صنف کے نام کا کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو جائے اسے منظوم افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن محسن بھوپالی جو تخلیقی تجربہ پیش کر رہے تھے منظوم افسانہ اس کی پوری نمائندگی نہیں کر پا رہا تھا۔ منظوم افسانے پہلے بھی کچھ لوگوں نے لکھے تھے لیکن محسن بھوپالی کی صنف اس سے کافی مختلف تھی۔ اس طرح منظوم افسانہ کہنے سے بات کچھ خاص بن نہ سکی۔

اس لیے غور وفکر جاری رہا، محسن بھوپالی، سحر انصاری اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ اس اہم کام میں خاص طور سے وابستہ رہے۔ سحر انصاری نے اس سلسلے میں لکھا ہے۔

> ''پھر ایک دن بیٹھے بیٹھے ہم نے اس رخ پر غور کیا انگریزی میں بھی دو الفاظ کے بعض اجزا کو ملا کر ایک نیا لفظ بنا لیا جاتا ہے۔ جیسے FICTION اور CRITICISM کو ملا کر CRICTION بنایا گیا ہے۔ اس لیے نظم اور افسانے کے امتزاج سے ''نظمانہ'' کا لفظ اس نئی صنفِ شعر کے لیے مناسب رہے گا اور اس میں شک نہیں کہ نظمانہ اب اس مخصوص مختصر منظوم افسانے کے لیے مختص ہو کر رہ گیا ہے جسے محسن بھوپالی نے ایک ہی صنف کے طور پر متعارف کرایا ہے۔''[۱۴]

اس طرح نظمانہ لفظ وجود میں آیا اور جسے اس نئی صنف کے لیے مناسب ترین سمجھا گیا۔ محسن بھوپالی نے نظم اور افسانے کو ملا کر نظمانے بنا دیا۔ لیکن ان کا اصل کمال دونوں اصناف کو ملا کر ایک نئی صنف بنا دینا نہیں ہے بلکہ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ

ان اصناف کی اہم صفات کو اس نئی صنف میں لے آنا تھا اور جسے محسن بھوپالی نے بڑے کمال کے ساتھ کیا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی اس نئی صنف سخن کے بارے میں فرماتے ہیں۔

> ''محسن بھوپالی نے ایک نئی صنف سخن کی داغ بیل ڈالی ہے اور اس کا نام ''نظمانہ'' رکھا ہے۔ یہ ایک تجربہ ہے جو روایت کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ کیونکہ اردو کی جدید شاعری اس مزاج اور انداز سے نا آشنا نہیں ہے، جس پر محسن نے اس صنف کی بنیاد رکھی ہے، رمز و ایما کی کیفیت، ایجاز و اختصار اور ایک ڈرامائی شان ان نظمانوں کی وہ خصوصیات ہیں جو حواس پر گہرے نقوش ثبت کرتی ہیں۔ اسی انداز کے ساتھ انسانی زندگی کی بنیادی اور اہم حقیقتوں کی ترجمانی ان نظمانوں میں بڑے سلیقے سے کی گئی ہے۔'' [۴۲]

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہے کہ ممتاز نقاد ڈاکٹر عبادت بریلوی اس نئی صنف کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس کی داغ بیل محسن بھوپالی نے ہی ڈالی ہے۔ وہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ محسن بھوپالی کے اس تجربہ میں روایت کی صورت اختیار کرنے کی بھی قوت ہے کیونکہ اردو کی جدید شاعری میں اس صنف کی کافی گنجائش ہے۔ کیونکہ اس شاعری میں رمز و ایما کی کیفیت بھی ہے، ایجاز و اختصار بھی ہے اور ایک ڈرامائی شان بھی ہے جو جدید دور کی نمایاں صفات ہیں۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ان نظمانوں میں انسانی زندگی کی بنیادی اور اہم حقیقتوں کی بھرپوری ترجمانی ملتی ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو کسی شعری تجربہ کو معتبر بناتی ہیں اور ان کے روایت بننے کے امکانات کو آگے بڑھاتی ہیں۔

عبادت بریلوی کی اس تحریر سے ایک اشارہ یہ بھی ملتا ہے کہ نظمانہ بنیادی طور پر ایک شعری صنف ہے اور اس میں جدید ''شاعری'' کی صفات موجود ہیں انھوں نے ان نظمانوں میں افسانوی صفات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ جب

کہ محسن بھوپالی کا اسرار افسانہ اور نظم کی آمیزش سے وجود میں آئی نئی صنف پر تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی بنیادی طور پر افسانے کے ناقد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ''افسانے کا فن'' اور ''داستان سے افسانے تک'' ان کی مشہور کتابیں ہیں جو اردو میں افسانوی ادب کی تنقید میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ اس لیے جب وہ ان نظمانوں کی تعریف کرتے ہیں لیکن ان میں موجود افسانوی صفات کا ذکر نہیں کرتے ہیں تو یہ سوال بھی خود بخود ذہن میں ابھرنے لگتا ہے کہ کہیں یہ اس بات کا اشارہ تو نہیں ہے کہ ان میں افسانہ پن نہیں ہے؟ اس طرح عبادت بریلوی کا اعتراف کسی حد تک ادھورا سا محسوس ہوتا ہے۔

اس ضمن میں عہد حاضر کے اہم ترین نقاد، تخلیق کار اور دانشور شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے اس لحاظ سے زیادہ اہم ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اپنے بیان میں ان نظمانوں میں افسانوی صفات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس طرح شمس الرحمٰن فاروقی اس صنف اور اس صنف کے خالق محسن بھوپالی کی نظمانوں کی صفات کے بارے میں کچھ اہم باتے در ہیں، وہ فرماتے ہیں۔

> ''افسانہ یا واقعہ یا مکالمہ برقرار رکھتے ہوئے مختصر نظم کی تاثیر کو ہاتھ سے نہ جانے دینا بڑے معرکہ کا کام ہے۔ محسن بھوپالی ''نظمانے'' میں یہ معرکہ سر کرنے میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ گرد و پیش کے حقائق پر ان کی نگاہ بصیرت کے بجائے فوری تاثر کی حامل ہے اور ان کے یہاں تفکر سے زیادہ مشاہدے کا رنگ نظر آتا ہے ورنہ یہ صنف (جس کے وہ موجد کہے جا سکتے ہیں) تفکری طرز اظہار کے لیے بھی بہت مناسب ہے۔ محسن کے نظمانوں میں طنز کا رنگ غالب ہے لیکن ان کے طنز میں تلخی کا تشنج نہیں بلکہ ایک طرح کی سنجیدگی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ محسن بھوپالی اس صنف کے مزید امکانات کو بھی بروئے کار لائیں گے۔''[۳۴]

شمس الرحمٰن فاروقی نے نظمانے میں افسانہ واقعہ اور مکالمہ کو افسانہ کی اہم خوبیاں بتائیں ہیں جو نظمانوں میں ہو سکتی ہیں ساتھ ہی ان میں مختصر نظم کی تاثیر بھی ہونی چاہیے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق محسن بھوپالی نے اس صنف میں فنی اور تکنیکی معرکہ کو سر کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ اگرچہ شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق اس صنف میں فکری شاعری کے بڑے امکانات موجود ہیں لیکن محسن بھوپالی کے بیشتر نظمانے مشاہدہ اور فوری تاثر پر مبنی ہیں۔ جس طرح احمد ندیم قاسمی نے محسن بھوپالی کے قطعات میں طنز کی اہمیت کی شناخت کی تھی اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی محسن بھوپالی کے نظمانوں میں طنز کو ایک بہت بڑی قوت تسلیم کیا ہے اور توقع ظاہر کی ہے کہ محسن بھوپالی اس صنف سخن میں مزید امکانات کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں گے۔

دوسرے ناقدین نے بھی نظمانے کی صنف اور اس کے امکانات کو قبول کیا ہے اور یہ بھی قبول کیا ہے کہ محسن بھوپالی اس صنف سخن کے موجد ہیں۔ لیکن نظمانے کی صنفی شناخت کے بارے میں جو بات خود محسن بھوپالی کہتے ہیں وہ بہت اہم ہے۔ نظمانے کی شناخت اور اس کی شکل وصورت کی شناخت کے بارے میں محسن بھوپالی کہتے ہیں۔

> ''ایسی نظم جس میں نظم اور افسانہ دونوں کا عنصر موجود ہو، ایسی نظم جس میں پوری ایک کہانی کو قلم بند کر دیا گیا ہو، اسے میں نے نظمانے کا نام دیا ہے اور ۱۹۷۵ء میں نظمانے کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تو اس صنفِ سخن کو احمد ندیم قاسمی، شمس الرحمٰن فاروقی، عبادت بریلوی نے بہت سراہا۔''[۴۴]

اس سے ظاہر ہے کہ محسن بھوپالی بھی اس نئی صنفِ سخن کو نظم ہونے کا اعتراف کرتے ہیں لیکن وہ افسانے کی صرف صفات نہیں بلکہ اس کے عنصر کے شامل ہونے کی بات کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ایسی نظم ہوتی ہے جس میں پوری ایک کہانی کو

قلم بند کیا جاتا ہے۔ اس لیے محسن بھوپالی نے اس صنف میں افسانے کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے لیکن وہ ابھی ایک طرح سے اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ بنیادی طور یہ ایک نظم ہوتی ہے۔

اس طرح اردو میں 'نظمانے' کے نام سے ایک نئی صنف سخن شروع ہوئی، جس کے موجد خود محسن بھوپالی ہیں۔ یہ ایک مختصر نظم کی صنف ہے، اس میں نظم کی تمام خوبیاں موجود ہوتی ہیں لیکن نظم کا اختتام افسانوں کی طرح بہت موثر انداز میں ہوتا ہے۔ اس میں افسانے کی طرح ارتقا بھی ہوتا ہے۔ واقعات کا بیان بھی ہوتا ہے اکثر مکالمے یا کردار بھی ہوتے ہیں۔

محسن بھوپالی کے تین شعری مجموعے ایسے ہیں جن میں نظمانے شامل ہیں۔ لیکن ایک مجموعہ صرف نظمانوں کا ہے اور اس کا نام بھی ''نظمانے'' ہی ہے۔ نظمانوں پر مشتمل ان کے مجموعوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ نظمانے ۱۹۷۵ء

۲۔ روشنی تو دیے کے اندر ہے، (نظموں، غزلوں قطعات اور نظمانوں پر مبنی) ۱۹۹۶ء

۳۔ منزل (غزلوں، نظموں اور نظمانوں پر مبنی) ۲۰۰۳ء

محسن بھوپالی نے نظمانے کا آغاز تو ۱۹۶۲ء میں شروع کیا تھا اور وہ مختلف رسالوں میں شائع ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن نظمانے کی صنف اور نظمانے کے حوالے سے خود محسن بھوپالی کی شناخت اس وقت قائم ہوئی جب ۱۹۷۵ء میں ان کا شعری مجموعہ ''نظمانے'' شائع ہوا۔ اس سے قبل کہ ہم نظمانے کی صنف اور محسن بھوپالی کے نظمانوں پر کچھ مزید بحث کریں بہتر ہوگا کہ ان کی چند نظمانوں پر نظر ڈال لیں۔ جس سے بات صرف ہوا میں نہ ہو کر زمینی حقائق کی بنیاد پر بات کی جا سکے۔

نصیحت

پریس میں فوٹو اور پتے کا رکھنا

اچھی عادت ہے بیٹا!
ایک بار جب-میرا ایکسیڈنٹ ہوا
تو لوگ مجھے گھر لے آئے تھے

پہلے ایسا ہوتا ہوگا،
اب تو ڈیڈی سب سے پہلے،
لاش کا بٹوہ پار کیا کرتے ہیں لوگ!

پچھتاوا

دوپٹہ رنگنے کی اجرت اس نے واپس کردی
بولا--بٹی آئندہ بھی
تم سے پیسے نیں لوں گا
--اور ایک دن یہی مقدس رشتہ اس نے توڑ دیا

روشن راتوں جگمگ کرتی گلیوں میں اب،
رنگ برنگے، جھلمل کرتے دوپٹے کے بوجھ تلے
میں سوچ رہی ہوں
کوئی مرا بے رنگ دوپٹہ
پھر سے واپس لادے

ان دونوں نظمانوں میں سماج کے اخلاقی زوال کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پہلے نظمانے میں ایکسیڈنٹ کے حالات کا ذکر ہے کہ پہلے ایکسیڈنٹ سے دوچار ہونے والے شخص کا لوگ پرس سے نام و پتہ دیکھ کر اس کے گھر تک پہنچا آتے تھے۔ جب کہ دوسری صورت حال میں بیٹا کہتا ہے کہ اب پرس میں

نام پتہ رکھنا بے معنی ہے کیونکہ اب لوگ ایکسیڈنٹ ہونے والے شخص کا سب سے پہلے پرس ہی چراتے ہیں۔ یہ ایک بڑے انسانی اخلاقی زوال کو پیش کرتا ہے۔

دوسرے نظمانے میں ایک رنگ ریز ایک لڑکی کو اپنی بیٹی کہہ کر اس سے پیسے لینے سے منع کرتا ہے اور ایک دن موقع پا کر وہ اس لڑکی کی ہی عزت تار تار کر دیتا ہے جسے وہ بیٹی کہتا تھا۔ یہ بھی گہرے اخلاقی زوال کی کہانی ہے ان دونوں کا موضوع ایک ہی ہے یعنی اخلاقی زوال لیکن دونوں کی کہانی بالکل الگ ہیں۔ یہی بنیادی فرق ہے شاعری کی دوسری اصناف اور نظمانے میں۔ افسانے میں بنیادی فرق تفصیلات اور زمینی سچائیوں کا بیان ہوتا ہے جب کہ شاعری میں تجریدی احساس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جس سے اگر موضوع ایک ہو جائیں تو یکسانیت آ جاتی ہے۔ یہاں ان دونوں نظمانوں میں موضوع ایک ہی ہونے یعنی دونوں نظمانے اخلاقی زوال کے موضوع پر ہیں پھر بھی پس منظر الگ ہونے کی وجہ سے دونوں نظمانوں میں بہت فرق نظر آتا ہے۔ اسے ایک کامیاب نظمانے کی علامت کہا جا سکتا ہے اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ دونوں میں افسانہ اور نظم دونوں کی صفات موجود ہیں۔

مجموعی طور پر محسن بھوپالی کی شاعری بنیادی طور پر ایک قسم کا احتجاج ہے، یہ احتجاج صرف سیاسی نہیں ہے یہ احتجاج اپنے ضمیر کو بچانے کی صدا بھی ہے، زندہ رہنے کے لیے انسان کے سمجھوتوں کی چیخ بھی ہے۔ یہ نظمانے خود غرض سماج کے خلاف احتجاج کی چیخ بھی ہیں۔ سماج کی اجتماعی زوال کے خلاف یہ نظمانے ایک احتجاج بن کر بھی ابھرتے ہیں۔

بھائی چارا

تمام انسان ہیں--ٹھہریے گا
یہ کیسی دستک ہے!--دیکھ آؤں
میں کل سے بھوکا ہوں

''راہِ للہ'' --ایک روٹی
عجیب ہو تم --یہ کیا طریقہ ہے
کچھ نہیں ہے-- چلو یہاں سے

بھلا سا موضوعِ گفتگو تھا
--لو یاد آیا-- میں کہہ رہا تھا
تمام انسان ہیں ایک اکائی
تمام انسان ہیں بھائی بھائی

اس نظمانہ میں زندگی کے تضادات خاص طور سے دانشور طبقے کے تضادات کو نہایت طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اس کی مزمت بھی کی گئی ہے۔ وہ انسان کی بات کر کے لوگوں کی واہ واہی تو لوٹ رہا ہے لیکن خود اس میں انسانیت کا نام ونشاں بھی نظر نہیں آتا ہے۔ وہ ایک روٹی کا سوال کرنے والے شخص کو نہ صرف روٹی دینے سے منع کرتا ہے بلکہ اسے ذلیل بھی کرتا ہے۔ ہمارے سماج میں اب یہ روش عام ہو چکی ہے۔ سیاست دانوں میں یہ روش تو پرانی ہے لیکن دانشور طبقے سے ابھی ایسی امید نہ تھی لیکن وہ بھی اب اسی روش پر چل نکلا ہے۔ بلکہ ہر طبقہ اس طرح کی دہرے پیمانے کو اختیار کر رہا ہے۔ یہ انسانیت کے زوال کی ایک زندہ مثال ہے۔

گروپ فوٹو

سینہ تانے چند سپاہی،
ایک افسر
اور کچھ اسمگلر

پھینک دیا اخبار کو اس نے یہ کہہ کر
شکر کہ میری ''گینگ'' کا اس میں

کوئی اصلی فرد نہیں!

انتقام

مالک کے گرگوں نے اس کو جتادیا تھا
بوائکر بند ہوا تو اس کی خیر نہیں!
پھر بھی---وہ دھمکی سے بے پرواہو کر
مشترکہ مقصد کی خاطر ڈٹا رہا

دوسرے دن---جب سورج نکلا
چمنی کے دھوئیں میں شامل تھی
انسانی گوشت کی بو!

ان دونوں نظمانوں میں بدماشوں، افسروں اور تاجروں کے آپسی رشتے پر روشنی پڑتی ہے کہ کس طرح سے یہ گروہ ایک دوسرے سے تعاون کر کے لوگوں کے حقوق کو دبا رہے ہیں لوگوں پر ظلم وستم کر رہے ہیں اور عام آدمی اپنے آ کو بہت بے سہارا محسوس کر رہا ہے۔ ان نظمانوں میں نظموں کا تاثر تو ابھرتا ہی ہے کہ وہ منظوم بھی ہیں اور مختصر بھی ہیں لیکن افسانہ پن بھی بہت خوبی کے ساتھ ابھر کر آیا ہے۔ دونوں میں جرم ہے، تجسس ابھرتا ہے، اور نہایت چونکانے والا اختتام ہے اس طرح یہ دونوں نظمانے اپنی ہیئت کے اعتبار سے بہت ہی اچھے نظمانے ہیں۔ اور ایک طرح سے یہ نظمانے مثالی نظمانے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسرے نظمانے میں ترقی پسند فکر کا زیادہ واضح اثر نظر آتا ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح سرمایہ دار مزدوروں کو پہلے لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کرتے ہیں بیشتر موقعوں پر وہ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی مزدوروں کا سچا رہنما نکل آئے جو نہیں بکتا ہے۔ وہ بدماشوں کا سہارا لے کر ان کا قتل کروا دیتے ہیں۔ اور ان کی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش کر دی جاتی ہے۔

اس مجموعے کے آخر میں تقریباً دس نظمانے جنسی بے راہ روی کی مختلف صورت حال پر مبنی ہیں۔ یہ سبھی نظمانے کسی نہ کسی طور پر معاشرے میں پھیل رہی اسی وبا کے موضوع پر ہیں اس میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔عورتیں بھی ہیں مرد بھی ہیں۔عورتوں میں کنواری لڑکیاں بھی ہیں، شادی شدہ اور بیوہ عورتیں بھی ہیں، مانگنے والیاں بھی ہیں، کال گرل اور طوائفیں بھی ہیں۔ اسی طرح مردوں میں بھی مختلف قسم کے لوگ ہیں۔لیکن مردوں میں بیشتر اونچے طبقے کے مختلف نمائندے ہی ہیں۔ان نظمانوں میں یہ جنسی بے راہ روی بیشتر جدید زندگی کی دین ہے۔جن کا اخلاقی زوال ہو چکا ہے۔اس سلسلے کے بہت سے نظمانے ہیں لیکن یہاں صرف دو مثالیں دی جارہی ہیں۔

حقِ ہمسایہ

شب کی اجرت،
بوسیدہ صندو میں رکھ کر
لوٹ آئی

اور جاتے جاتے بولی--ٹھہرو!
چھوٹا پیگ برانڈی کا،
میں اپنے بچے کو دے لوں
ورنہ رات میں شور کرے گا
اور ہمسائے جاگ اٹھیں گے!

دل کا چور

بھیڑ میں گھس کر اس نے دیکھا
کوئی پگلی،
ابھرے پیٹ پہ ہاتھ مار کر چیخ رہی تھی
--اس کے باپ کی موٹر ہے،

اور میرے پاؤں میں چھالے ہیں
اتنا سن کر دل بھر آیا
ایک لمحے کو ٹھٹکا
لیکن نظریں ٹکرانے سے پہلے،
تیزی سے وہ باہر آیا -- ''سیٹ'' پہ بیٹھا
اور گاڑی کو موڑ کے آگے نکل گیا!

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ دونوں دونوں نظمانے جنسی بے راہ روی پر ہیں اور دونوں نظمانوں میں بالکل مختلف صورت حال کا بیان کیا گیا ہے۔ لیکن پہلے نظمانے میں رات میں چھوٹا بچہ جگ نہ جائے اس لیے اتنے چھوٹے بچے کو برانڈی دینا ایک ایسی صورت حال ہے جو بہت ہی دل دوز ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے نظمانے میں جو ڈرامائی کیفیت پیدا ہوگئی ہے وہ بھی غیر معمولی ہے کہ اس کے دل میں اس عورت کے۔ لیے ہم دردی ابھرتی ہے اور اس کا دل بھر آتا ہے۔ لیکن خود بھی وہ اسی طرح کے کام کرتا رہا ہے اس لیے اس عورت سے آنکھ نہیں ملا سکا اور کہیں اس کا ماضی اس کے سامنے نہ آجائے کہ اسے اپنے آپ سے آنکھ ملانا مشکل ہو جائے۔

نظمانوں پر مشتمل محسن بھوپالی کا دوسرا شعری مجموعہ ''روشنی تو دیے کے اندر ہے'' ہے جو ۱۹۹۶ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کے دیباچے میں ڈاکٹر اسلم فرخی نے لکھا ہے۔

''نظمانے ایک نیا اور دلکش شعری تجربہ ہے جس میں نظم اور افسانے کے امتزاج سے معاشرتی ناہمواریوں، منفی فکر اور زندگی کے تلخ حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔''[۴۵]

اس اقتباس سے بھی یہ صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر اسلم فرخی بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ نظمانہ بنیادی طور پر ایک شعری صنف سخن ہے۔ لیکن وہ آگے یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس میں نظم اور افسانے کے امتزاج سے معاشرتی ناہمواریوں، منفی فکر

اور زندگی کے تلخ حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تلخ حقیقتیں، معاشرتی ناہمواریاں اور منفی فکر کو افسانے اور نظم دونوں اصناف میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس بیان سے بھی ظاہر ہے کہ نظمانہ بنیادی طور پر شاعری ہی ہے لیکن اس میں کچھ افسانوی صفات بھی موجود ہوتی ہے۔

اس مجموعے کے نظمانے بھی بنیادی طور پر ''نظمانے'' مجموعے کے نظمانوں کی طرح ہی ہیں لیکن یہاں ایک طرح کی توسیع نظر آتی ہے۔ یہاں موضوعات میں کہیں کہیں تنوع نظر آتا ہے تو کہیں فنی لوازمات کا بھی اضافہ محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور یہاں ترقی پسندی پر مقدار و معیار دونوں اعتبار سے زیادہ نظمانے ہیں۔ اگرچہ ترقی پسند فکر کا اثر ان کے یہاں پہلے سے ہی ہے۔ لیکن یہاں زیادہ پختگی نظر آتی ہے ساتھ ہی ان نظمانوں میں براہ راست خطابت نہیں ہے، نعرے نہیں ہیں بلکہ یہاں تجربہ کی ایک نئی نوعیت ہے۔

تعبیر

اپنے ملک پہ اک مدت سے قائم ہے
گنتی کے ان سرداروں
......اور جاگیروں کے پانے والوں
کی نسلوں کا راج
آزادی سے بڑھ کر جن کو پیارا تھا
انگریزوں کا تاج!
سوچ رہا ہوں شاید اب کے
قسمت دے دے مظلوموں کا ساتھ
استحصالی ٹولے سے...... پائے قوم نجات

صبح ہوئی تو گونج رہا تھا،

بے ہنگم ناروں کا شور:
اپنے خواب کی ہم نے کی...... من مانی تعبیر
پھر ہے اپنے قبضے میں...... ملت کی تقدیر
پاکستان کا مطلب کیا؟...... موروثی جاگیر!
نئی سحر!

سارے پارک میں،
گونج رہی تھی اک آواز
اے مجبورو اے مظلومو
ناانصافی کی چکی میں
اک مدت سے پسنے والو
...... آج تمہاری قسمت میں محرومی ہے
لیکن کل کا سورج خوشیاں لائے گا

...... اور گلی کے نکڑ پر
کوئی عورت چیخ رہی تھی
نئی سحر کے لانے والو
پہلے میرا بیٹا لا دو!

ان دونوں نظمانوں میں ترقی پسند کے بالکل مختلف تجربات ابھر کر آتے ہیں پہلے نظمانے میں سیاست دانوں پر گہرا طنز ہے کہ ہر انتخاب کے وقت یہ سیاست دان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف بول کر عوام کے ووٹ لیتے ہیں اور وہ وعدہ کرتے ہیں کہ اس بار یہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا نہیں بلکہ عوام کے آرام و آسائش کا خیال رکھیں گے۔ لیکن انتخاب کے بعد وہ ایک بار پھر انھیں کی حمایت میں کام کرنے لگتے ہیں۔ دوسرے نظمانے میں خود ترقی پسندوں پر طنز ہے کہ وہ پاکستانی و

دنیا کے سماجی و سیاسی نظام بدلنے کی بات کرتے ہیں اور ان کی باتوں میں آ کر کچھ جوشیلے نوجوان اپنی جان گنوا بیٹھتے ہیں جب کہ وہ لوگ کر کچھ باتے نہیں ہیں بس کوئی عورت اپنے بیٹے سے محروم ہو جاتی ہے۔

مصلح اس لحاظ سے مختلف نظمانہ ہے کہ اس میں پہلی بار مذہبی رہنماؤں پر طنز ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ کچھ مذہبی ٹھیکے دار مذہب کا سہارا لے کر لوگوں کو ڈراتے دھمکاتے ہیں لیکن دراصل یہ ایک طرح کی مذہبی غنڈہ گردی ہے اور اس کے ذریعے وہ پیسے حاصل کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مقابلہ میں پولس کس طرح سے قتل کرتی ہے وہ نہ صرف بے قصور عوام کا قتل کرتی ہے بلکہ اس کے موت کے ساتھ ایسا کھلواڑ کرتی ہے کہ لوگوں کی موت بھی ان کے لیے ایک تفریح بن جاتی ہے۔

مصلح

ہیلو......ہیلو!
میں تنظیم اہل وطن سے بول رہا ہوں
پکچر ہاؤس میں جو عریاں تصویروں کا بورڈ لگا ہے
اسے ہٹا دو......ورنہ
اچھا صاحب......مینیجر جب آئے گا......ہم کہہ دے گا

......جی میں اصغر مینیجر......جی ہاں......جی ہاں
......اک ہفتے تک رہنے دیں
پھر میں خود ہی ہٹوا دوں گا
......میرے لائق کوئی خدمت؟
چندے کی بک بھیج رہا ہوں
خود ہی چندہ بھر دینا!

......مقابلہ

ہم نے تم کو چھوڑ دیا ہے،
بھاگو...... بھاگو
تڑتڑ تڑ تڑتڑ!

''خوداعتمادی''، ''نئی پود'' اور ''فرق'' نظمانے بھی اس طرح زندگی کے مختلف النوع تجربات کو پیش کرتے ہیں۔ یہ سارے تجربات پاکستان کی سیاسی، سماجی اور جدید زندگی کی دین ہیں۔ ان سب نظمانوں میں طنز بہت نمایاں ہے۔ جو محسن بھوپالی کا ایک بہت بڑا ہتھیار ہے۔ اور کہنا پڑتا ہے کہ محسن بھوپالی کی شاعری کی تمام اصناف میں طنز ہر جگہ موجود ہے لیکن انھوں نے نظمانوں میں طنز کے ہتھیار کو جس طرح سے استعمال کیا ہے وہ دوسری اصناف میں شاید اتنا نمایاں نہیں ہو پایا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان نظمانوں میں محسن بھوپالی نے زندگی کی مختلف صورت حال اور واقعات کو پیش کیا ہے اور ان میں افسانوی صفات بھی موجود ہیں خاص طور سے تقریباً ہر نظمانے میں کردار ہیں، مکالمے ہیں اور واقعے ہیں۔ جب کہ شاعری کی دیگر اصناف میں تجربات واحساسات زیادہ نمایاں ہیں وہاں محسن بھوپالی کا طنزیہ لہجہ اس طرح سے نمایاں نہیں ہو سکا ہے جیسے نظمانوں میں ابھر کر آیا ہے۔

خوداعتمادی

سنا جی تم نے!
تمہاری بیٹی......کلب میں جاتی ہے
بوائے فرینڈ اس کو چھوڑنے کے لیے بھی اکثر
......گلی تک آتے ہیں
جانے تم کو خبر بھی ہے یا......
......خبر ہے بیگم میں خوش ہوں اب وہ
نئی روِش کے نئے تقاضوں کو جانتی ہے
اور اس میں اب خوداعتمادی بھی آگئی ہے

......مگر جو مہمان آ رہا ہے
کچھ اس کے بارے میں تم نے سوچا،
خود اعتمادی تو آ گئی ہے!

نئی پود

سلمٰی......میں تو ٹونی کو
کہتے کہتے ہار گیا ہوں
......تم بھی کوشش کر دیکھو

بیٹا اپنی مرضی سے گر شادی کی تو
......دودھ نہیں بخشوں گی
......ممی! وہ کیا ہوتا ہے!

فرق

خود غرضی کی چادر اوڑھ کے
کہنے والے
چاہت کی بازی میں،
اپنی محبوبہ کو حاصل کر لینا ہے معراج

دل کی بات بھی سن:
حاصل کرنا ہے تو پیارے
جاں سے گزرنا سیکھ
محبوبہ اور مطلوبہ میں
فرق بھی کرنا سیکھ

''منزل''، محسن بھوپالی کا تیسرا ایسا مجموعہ ہے جس میں نظمانے شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں کل ۱۶ نظمانے ہیں جن کے نام حسب ذیل ہیں۔ واعظ، نقاد سے مکالمہ، عمر رفتہ، زندگی کے لیے، ناشر و شاعر، قطع ید، تضاد، چشم پوشی، ڈرائنگ روم ٹارچر، دو شہر ایک کہانی، وہ کیسا دور تھا، ستم کشتہ، تفتیش، شریک کار، محافظ اور ماسی اس مجموعے کے نظمانے ہیں۔ اس مجموعے پر ہم ''واعظ'' نظمانے سے بات شروع کریں گے۔

واعظ

واعظ فرما کے وہ
گارڈ کے ساتھ
اپنی پجیرو میں کب کے چلے بھی گئے
اور میں سات نمبر کے اسٹاپ پر
ڈیڑھ گھنٹے سے ہوں
کوچ کا منتظر

واعظ میں زندگی کی ناہمواریوں پر ایک بلیغ طنز ہے کہ دوسروں کو واعظ دینے والے جنھیں زندگی میں زیادہ صبر قناعت سے کام لینا چاہیے، ان کے پاس دولت کی ریل پیل ہے۔ اور جو بے چارے غریب ہیں، محنت کش ہیں انھیں وعظ سنایا جا رہا ہے۔

عمر رفتہ

وہ بھی دور تھا
جب منے سے میں کہتا تھا
بیٹا دیکھ کے چل

ہوتے ہوتے ایسا وقت بھی آیا ہے

منّے سے اب مجھ کو سننا پڑتا ہے
داداجانی دیکھ کے چلیے نا!

تضاد

سگنل پر جب گاڑی روکی
ننھے رونی نے پوچھا!
ابو آخر ایسا کیوں ہے
بازو والی لمبی کار میں دو بیٹھے ہیں
اور اپنی سوزوکی پک اپ میں
ہم ہیں بارہ لوگ

بیٹا تم کو کیا سمجھاؤں
جب تم میرے اتنے ہوگے
فرق سمجھ میں آجائے گا

''عمر رفتہ'' اور ''تضاد'' اس لحاظ سے بہت خوبصورت نظمانے ہیں کہ ان میں زندگی کے بے حد خوبصورت تجربہ کو بیان کیا گیا ہے جس میں کوئی سیاست نہیں، سماجی تضادات نہیں ہے لیکن ہر ایک کی زندگی میں آنے والے ایک بے حد فطری تجربہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس نظمانے میں وقت صورت حال کو اپنے آپ کس طرح متضاد بنادیتا ہے اس بات کو نہایت آہستگی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظمانہ محسن بھوپالی کے عام لہجہ سے کافی منفرد ہے جہاں ذاتی احساس اجتماعی احساس بن جاتا ہے۔ جب کہ محسن بھوپالی کے یہاں بیشتر اس کے برعکس ہوتا ہے کہ وہ عام طور پر اجتماعی احساس کو ذاتی احساس بناتے ہیں۔

زندگی کے لیے

رات کے دو بجے

تیسری بار
ڈانسگ ہال میں
رقص کرتے ہوئے
اس کے پاؤں لرزنے لگے
لوگ سمجھے کہ یہ رقص کا
کوئی انداز ہے
تالیوں سے فضا گونج اٹھی
اور وہ دیکھتے دیکھتے
فرش پر گر پڑی

ماسی

شوہر کام نہیں کرتا؟
کرتا ہے جی؟
صبح چھوڑ کر جاتا ہے
اور شام کو لینے آتا ہے

''زندگی کے لیے'' اور ''ماسی'' اس اعتبار سے ایک جیسے نظمانے ہیں کہ ان دونوں میں عورت کی مجبوری کو دکھایا گیا ہے کہ اسے جینے کے لیے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ ''زندگی کے لیے'' میں جہاں ایک بہت جانا پہچانا موضوع ہے کہ عورت کی مجبوری اسے کیا کیا کرنے پر مجبور کرتی ہے یہ موضوع تو بہت پرانا ہے لیکن محسن بھوپالی کے اندازِ بیاں نے اس میں ایک خوبصورتی پیدا کردی ہے۔ جب کہ ''ماسی'' بالکل نیا تجربہ ہے لیکن عورت کی مجبوری یہاں بھی ہے۔ پہلے نظمانے میں جہاں حالات کی ستم ظریفی ہے وہیں دوسری نظم میں طنز ہے۔

تفتیش

کھلے میدان میں ہیں باپ بیٹے

مصلے پر، ادھر،

ماں ہے، بہن ہے!

تفتیش بہت چھوٹا نظمانہ ہے صرف تینوں مصرعوں پر مبنی لیکن اس میں بہت ہی کفایت لفظی سے ایک پورے واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں سیاسی اور پولس کا جبر بھی ہے، ماں اور بہن کی محبت اور مجبوری بھی ہے، ایک بھراپورا پریوار بھی ہے مذہبی عقیدت بھی اور اس مذہبی ملک میں اس طرح کے حالات ہیں کہ اس کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ بھی نہیں ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ دونوں متضاد گروہ اسی مذہب کا سہارا لیتے ہیں۔

محسن بھوپالی نے ہیئتی اعتبار سے ان تمام نظمانوں میں ایک خاص اہتمام کیا ہے کہ سارے نظمانے دو حصوں پر مبنی ہیں اور ان دونوں حصوں میں دو الگ الگ حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ اور ان دو منفرد حالات سے جو حالات یا وقت کے تضادات بیان کیے گئے ہیں اس سے بغیر اعلان کیے دونوں کے بین السطور میں ایک زمانی تغیر پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ نظمانے بہت اچھے بن گئے ہیں۔ زندگی کی دو متضاد کیفیات کو ایک ساتھ ایک نظم میں پیش کر دینا اپنے آپ میں بہت بڑی بات ہے۔ اس کیفیت سے ان نظمانوں میں ایک اور بڑا کام لیا گیا ہے۔ دراصل ہیئتی تجربہ سے ایک گہرا طنز پیدا ہو گیا ہے اور یہ طنز خارجی سطح پر نہیں ہے ان میں شاعر خود ان کے تضادات کو بیان نہیں کرتا ہے بلکہ ہیئتی تکنیک کے ذریعے یہ طنز اپنے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ادب میں یہ بات بہت اہم ہوتی ہے کہ کسی بات کو خود براہ راست نہ بیان کر کے بلکہ ان کے حالات سے وہ متضاد معنی پھوٹیں تو اس طرح ایک بڑی شاعری یا فکشن ابھرتا ہے۔ ادب میں اسے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اور ایسا ادب بڑے تخلیقی تجربے میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ محسن بھوپالی کے ان نظمانوں میں پاکستان کی تاریخ تہذیب، مذہب اور سماج سب کچھ نظر آتا ہے۔ زندگی کے مختلف تجربات و

واقعات کو محسن بھوپالی نے بہت خوبصورتی سے نظمانوں میں اظہار خیال کیا ہے۔ ان میں روایتی زندگی کے مسائل بھی ہیں اور نئی طرز زندگی سے ابھرے سوال بھی ہیں۔ لیکن محسن بھوپالی نے ان مختلف کیفیات کو بیان کرنے میں اپنے آہنگ کو قائم رکھا ہے۔ محسن بھوپالی نے جن تجربات واحساسات کو بیان کیا ہے ان کے مطالعے سے لگتا ہے کہ یہ تجربات واحساسات بہت موثر انداز میں ان نظمانوں میں بیان ہوئے ہیں۔ شاید کوئی دوسری روایتی صنف ان تجربات واحساسات کو اتنے موثر انداز میں نہ بیان کر پاتی۔ اور یہی جواز ہے ایک نئی صنف سخن میں تجربہ کرنے کا۔ اور محسن بھوپالی اس تجربے میں یقیناً کامیاب رہے ہیں۔

(۴) ہائیکو

شعر وادب کی دنیا میں ایک دوسری تہذیبوں سے لین دین ہمیشہ سے ہوتا رہتا ہے۔ کبھی موضوع کے اعتبار سے اور کبھی ہیئت کے اعتبار سے اردو نے دوسری تہذیبوں سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح اردو سے بھی کئی تہذیبوں نے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً غزل آج ہندستان اور ہندستان کے باہر بھی بہت سی ادبی روایتوں کا حصہ بن چکی ہے۔ جو بیشتر اردو یا فارسی سے ہی دوسری زبانوں میں گئی ہے۔ اسی طرح بہت سی اصناف اردو میں بھی دوسری زبانوں سے داخل ہوئی ہیں۔ مثلاً افسانے اور ناول کی روایت مغرب سے آئی ہے۔ شاعر جب محسوس کرتا ہے کہ وہ جو کچھ اور جیسے کہنا چاہ رہا ہے وہ اردو کی موجودہ اصناف میں ممکن نہیں ہو پا رہا ہے اور جب اس کی خواہش کے مطابق دوسری صنف سے تعارف ہوتا ہے تو وہ اسے اس زبان سے مستعار لے کر اس صنف میں طبع آزمائی کرنے لگتا ہے۔

کسی صنف میں طبع آزمائی کرنا دوسری بات ہے اور اس صنف کا اس ادبی روایت مین رائج ہو جانا دوسری بات۔ بیسویں صدی میں اردو شاعری میں ہیئتی اور موضوعاتی اعتبار سے بہت سی اصناف میں طبع آزمائی کی گئی مثلاً آزاد نظم، نثری نظم،

سانیٹ، ترائیلے وغیرہ۔ تجربے تو بہت سی اصناف کیے گئے لیکن کچھ رائج ہو سکیں کچھ نہیں ہو سکیں۔ کسی صنف کا دوسری ادبی روایت میں رائج ہونا یا نہ ہونا اس کافی حد تک اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی اپنی روایت میں وہ صنف کہاں تک گھل مل سکتی ہے؟ یا اس صنف کی کتنی ضرورت ہے؟ کیا اس صنف میں جو بات کہی جا رہی ہے وہ اس کی اپنی روایت میں کسی دوسری صنف سے اس کی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی؟ ساتھ ہی کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اس صنف کو فروغ دینے کے لیے کچھ اداروں نے خصوصی کوشش کی اور اس سے لوگوں کو مالی فائدہ بھی ہوتا تھا۔ ایسے میں بھی بہت سے شاعر اس صنف کی طرف توجہ دینے لگتے ہیں۔

اردو میں ہائیکو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہائیکو جاپانی شاعری کی اہم ترین صنف سخن ہے۔ اگر چہ موجودہ ہائیکو کی تاریخ تقریباً سوا سو سال سے زیادہ نہیں ہے لیکن اس کی روایت بہت قدیم ہے اور کسی نہ کسی طور پر اس کا رشتہ تقریباً ہزار سالہ تاریخ سے جا ملتا ہے۔ ہائیکو کیا ہے اور اس کی صنفی شناخت کیا ہے؟ اس کے بارے میں اردو میں بھی کافی کچھ کہا جا چکا ہے اور کسی حد تک اس کی تعریف کا بھی تعین ہو چکا ہے۔

اس سے قبل کہ اردو میں ہائیکو کی روایت کو سمجھا جائے لازم ہے کہ پہلے اس صنف کی کے موضوعات اور ہیئت کو سمجھ لیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ ہائیکو ''ہائی'' اور ''کو'' کے میل سے بنا ہے۔ اس میں ''ہائی'' کے معنی ذہن یا دماغ ہوتا ہے، اس کے ایک معنی ''کھیل میں چھیڑ چھاڑ'' یا غیر سنجیدگی اور غیر حقیقی بھی ہوتے ہیں۔ جب کہ دوسرے لفظ ''کو'' کے معنی جملہ یا فقرہ ہوتے ہیں۔ اس طرح شروع میں ہائیکو کے معنی کھیل یا چھیڑ چھاڑ والے جملے یا فقرے ہوا کرتے تھے۔ اور لوگ اس سے لطف اندوزی کے لیے کھیلتے یا کہتے سنتے تھے۔ لیکن سترہویں صدی کے شاعر باشو نے اسے یکسر بدل دیا اور یہ ایک سنجیدہ ادبی صنف بن گئی۔ کوڈنشا انسائیکلو پیڈیا آف جاپان ہائکو کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔

''ہائیکو سترہ رکنی صنفِ سخن ہے جو ۵۔۷۔۵ کے تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ قدیم جاپانی شاعری کی اہم ترین صنف ہے جو آج کے جدید جاپان میں بھی مقبول ہے اور پچھلے برسوں میں دیگر مما لک میں بھی اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے جدید ہائیکو کی تاریخ کا آغاز ۱۸۹۲ء میں شیکی (Shiki) کی اصلاحات سے ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہائیکو کو ایک جدا اور ممتاز صنف سخن کا درجہ حاصل ہوا۔ شیکی نے ہائیکو کی تجدید کے سلسلے میں بعض بنیادی تصورات مثلاً موضوع کا جناؤ، بندش الفاظ اور باطنی ہم آہنگی پر زور دیا ہے لیکن اس نے اپنی اصلاحات میں ہائیکو کے دو روایتی عناصر یعنی سترہ ارکان کی پانچ سات پانچ کے تین مصرعوں میں تقسیم اور موسم یا اس کی علامت کے ذکر کو جوں کا توں رہنے دیا...''[۱]

اس انسائیکلو پیڈیا نے واضح طور پر اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ہائیکو ہیئت کے اعتبار سے ۵۔۷۔۵ ارکان کے تین مصرعوں پر مبنی ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ ہائیکو یوں تو ایک قدیم صنفِ سخن ہے لیکن جاپان میں جدید ہائیکو کا آغاز ۱۸۹۲ء میں شیکی کی جدید اصلاحات سے ہوتا ہے اور اسی کی کاوشوں سے ہائیکو کو جاپانی شاعری میں ایک جدا اور ممتاز حیثیت حاصل ہوئی۔ اس نے موضوع کے انتخاب اور بندش الفاظ پر کافی زور دیا ساتھ ہی اس نے ہائیکو کی باطنی ہم آہنگی پر بھی کافی زور دیا ہے اور ایک طرح سے اسے نئی زندگی دی ہے لیکن اس نے ہائیکو کی دو بنیادی صفات یعنی سترہ ارکان کے تین مصرعوں پر مبنی نظم جس میں ۵۔۷۔۵ کی تقسیم کو بھی لازمی حصہ مانا گیا ہے کو جو جاری رکھا۔

اس موضوع پر ہائیکو کے جدید عہد کے نقاد یاسودا نے اپنی کتاب ''جاپانی ہائیکو'' میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق دراصل شیکی نے ارکان کی قید کو قبول نہیں کیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ارکان میں کمی یا زیادتی بھی کی جا سکتی ہے وہ

آزادی کا قائل تھا لیکن جب اس آزادی کا دوسرے لوگوں نے غلط فائدہ اٹھانا شروع کیا اور دوسرے شعرا نے مختلف النوع تجربے کیے تو بعض اتنے خراب تجربے تھے کہ اس کا سارا حسن جاتا رہا اور اکثر نثری آہنگ پیدا ہو گیا ہے اس کے لیے شکی نے ''پروز یک'' کا لفظ استعمال کیا تھا جس کے معنی تاثرانہ اور غیر دلچسپ ہیں۔اس کے بعد شکی اپنے موقف سے باز آ گیا۔اگر چہ ۵۔۷۔۵ ارکان کی قید کو اس نے بعد میں بھی پوری طرح سے قبول نہیں کیا اور صرف سترہ یا اٹھارہ ارکان کہا۔لیکن ہیئت میں یہ آزادی بھی بعد میں کامیاب نہ ہو سکی۔اور یا سودا کے مطابق

''بالآخر ہائیکو کی سترہ ارکان کی روایتی طوالت کو تبدیل کرنے کی کوششیں رائے گاں ثابت ہو چکی ہیں اور اب ہائیکو کی سترہ رکنی نظم کی بنیادی تحریک کو سنجیدگی کے ساتھ چیلنج نہیں کیا جاتا۔''۴۷

اگر چہ ارکان کے سلسلے میں شکی کے ہیئتی تجربہ بعد میں قبول نہیں کیے گئے لیکن پھر بھی جاپانی ہائیکو میں شکی کا مقام بہت بڑا ہے۔اس نے ہائیکو کا جو مزاج اور معیار قائم کیا وہ بدستور جاری رہا۔بیسویں صدی کے ہائیکو کے عظیم شاعر کیوسی تاکاباما نے اس سلسلے میں اہم بات کہی ہے اس کا خیال ہے کہ

''میرے نزدیک فکر کا مخصوص ہیئت میں اظہار ایک تکنیک ہے۔ یہ تکنیک بذات خود فکر کو دوسرے تک منتقل کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔لوگ عام طور پر ہائیکو کی سترہ رکنی حیثیت کو ہی تسلیم کرتے ہیں جو ۵۔۷۔۵ کی ترتیب میں تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔وہ اپنے احساسات اور جذبات کو آپس میں ہائیکو کے اس فارم میں ظاہر کرتے اور پسند کرتے ہیں۔''۴۸

اس طرح ہائیکو کی ہیئت مستقل طور پر یہی طے ہو گئی یعنی سترہ ارکان پر مبنی اور ۵۔۷۔۵ کی ترتیب میں مصرعوں کی پابندی۔اس نے ہائیکو کو ایک مزاج بھی دیا جو مخصوص فکر میں بھی ڈھلی ہوئی ہو۔جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے ہائیکو کے موضوعات

میں بنیادی اہمیت موسم اوراس کے مختلف تلازمات کی ہے۔ چاہے وہ براہ راست موسم کا ذکر ہو یا اس کی خوبصورتی کا یا اس کی سختی کا ذکر ہو یا کسی اور طرح کا موسم کا ہونا لازمی پایا گیا۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ موسم کا ذکر براہ راست ہی ہو۔ یہ موسم علامتی یا استعاراتی نظام میں ڈھل کر بھی آ سکتا ہے۔ موسم سے انسانی زندگی کس طرح متاثر ہو رہی ہے اس کا بھی ذکر ہوسکتا ہے۔ لیکن کسی نہ کسی طور پر موسم کا ذکر ہائیکو میں شروع سے لازمی سمجھا جاتا رہا ہے۔

ہائیکو کی ہیئت اور مزاج کے بارے میں اس کی اپنی اصل زبان یعنی جاپانی میں سمجھنے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہائیکو اردو میں کس طرح آیا ہے؟ جب ہم اردو میں ہائیکو کا جائزہ لیتے ہیں تو اردو میں بھی شروع میں کافی ابہام تھے اور شعرا و ناقدین نے اپنے اپنے طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کی۔ لیکن کافی غور وفکر کے بعد کئی باتوں پر آہستہ آہستہ اتفاق بننے لگا۔ اردو میں ہائیکو کا مزاج اور آہنگ طے کرنے میں جن حضرات کا بہت اہم کردار رہا ہے ان میں محسن بھوپالی، سہیل احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد امین، پروفیسر احمد، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور رفیق سندیلوی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان سبھی نے ہائیکو کے بارے میں کافی سنجیدگی کے ساتھ لکھا ہے۔ جاپانی ہائیکو میں بھی اور اردو ہائیکو میں بھی سب سے اہم مسئلہ ہیئت یعنی ارکان، مصرعوں، اوزان اور بحر وغیرہ کا تعین ہے۔ شروع میں ان پر کافی اختلاف تھے لیکن بہت حد تک ماہرین ہائیکو ایک اتفاق پر پہنچ گئے ہیں۔ اس سلسلے میں محسن بھوپالی کی رائے بہت اہم ہے وہ لکھتے ہیں۔

> ''ہائیکو کے پانچ سات پانچ سلیبل (Syllable) کے مماثل اردو میں مندرجہ ذیل وزن پر تقریباً سب ہی اہم نقادوں اور ہائیکو پر تحقیق کرنے والوں نے اتفاق کیا ہے۔ جن میں پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، محمد امین اور رفیق سندیلوی وغیرہ شامل ہیں۔ وزن مع تقطیع ملاحظہ ہو۔

آ۔وا۔رہ۔پت۔تے

فع۔لن۔فع۔لن۔فع=۵

تم۔نف۔رت۔سے۔مت۔دے۔کھو

فع۔لن۔فع۔لن۔فع۔لن۔فع=۷

کل۔یہ۔کوں۔پل۔تھے

فع۔لن۔فع۔لن۔فع=۵''۴۹

اوزان کے سلسلے میں یہ ترتیب اب تقریباً سبھی کو قبول ہے شروع میں اس پر اختلاف ضرور تھے لیکن یہاں ایک مسئلہ اور بھی ہے جس کی طرح پروفیسر احمد علی نے اشارہ کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ

''چونکہ جاپانی زبان چینی زبان کی طرح Mono Syllabic یعنی ایک حرفی ہے۔اس لیے اس میں ہماری شاعری کی طرح اوزان کی جگہ عروض کی بنیاد Syllables پر ہے چنانچہ ہائیکو میں پہلے اور تیسرے مصرعے میں پانچ اور دوسرے میں سات Syllables ہوتے ہیں۔اس لیے اس کو اردو میں اپنانے میں قباحت اور دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔''۵۰

ظاہر ہے اردو میں آواز کا نظام جاپانی زبان کے آواز کے نظام سے مختلف ہے اس لیے دونوں کا براہ راست تقابل کرنا مشکل ہے۔اس لیے گہرے مشاہدے اور تقابل کے بعد جو نتیجہ حاصل ہوا وہ وہی ہے اور قریب ترین بحر وہی ہے جسے محسن بھوپالی نے دریافت کیا ہے اور تقطیع کر کے ثابت بھی کیا ہے۔

سہیل احمد صدیقی نے اردو ہائیکو کی تاریخ اور جاپانی شاعری کے اردو میں تعارف کی ایک پوری روایت مرتب کی ہے۔ان کے مطابق اردو میں جاپانی شاعری کا سب سے پہلا تعارف بیرسٹر سید حسن عابد جعفری نے کرایا تھا۔انھوں نے ۱۹۲۲ء میں اس عہد کے مشہور رسالہ ''نگار'' میں، جس کے مدیر نیاز فتح پوری تھے ایک مضمون ''جاپانی

شاعری پر ایک نظر'' شائع کیا۔ اس میں ہائکو، تنکا اور جاپانی شاعری کی دیگر اصناف کا تعارف کرایا گیا تھا۔ اس مضمون میں کچھ ہائیکو اور تنکا کے اردو ترجمے بھی پیش کیے گیے تھے۔ اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد اردو میں جاپانی شاعری کی طرف توجہ بڑھی۔

اس کے بعد دہلی سے نکلنے والے اپنے زمانے کے مشہور جریدہ ''ساقی''، (مدیر شاہد احمد دہلوی) نے ۱۹۳۶ء میں ایک پورا شمارہ جاپان نمبر کے نام سے شائع کیا تھا جو پورا شمارہ جاپانی شاعری خاص طور سے ہائیکو کے لیے وقف تھا۔ اس شمارے میں اس صنف پر بحث بھی تھی اور ہائکو کے ترجمے بھی تھے۔ نورالحسن برلاس نے اس شمارے کے لیے خاص مدد کی تھی۔ اور مترجمین میں عزیز تمنائی، فضلِ حق قریشی اور علی ظہیر کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ ترجمے کسی حد تک آزادی لے کر کیے گئے تھے۔ اس کے بعد حمید نظامی نے بھی کچھ ہائکو اردو میں ترجمہ کیے۔ میرا جی نے بھی اردو میں کچھ ترجمے کیے تھے۔

اس کے بعد اردو میں وقتاً فوقتاً ہائیکو لکھے جاتے رہے لیکن اس صنف پر کوئی خاص توجہ نہیں تھی بس کبھی کبھی کسی نے ایک آدھ ہائیکو لکھ دیے اور اس کی ہیئت کا بھی کوئی تعین نہیں تھا۔ اس کے بعد ہائیکو کے حوالے سے جو اہم نام اردو میں منظرِ عام پر آیا وہ محسن بھوپالی کا ہے۔ انھوں نے سندھی ہائیکو سے ترجمہ کیا تھا۔ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

> ''جاپانی صنفِ سخن ہائیکو سے میں ڈاکٹر تنویر عباس کے سندھی ہائیکو کے ذریعے متعارف ہوا تھا تنویر کے چند ہائیکو کا میں نے اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا جو ماہ نامہ ''افکار'' کراچی کے مئی ۱۹۶۳ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان میں ان ہائیکو کی اشاعت کو اولیت حاصل ہے۔ بعد میں جاپان قونصل خانہ کراچی کے زیرِ اہتمام ۱۹۸۲ء سے سالانہ بنیاد پر ہونے والے مشاعروں میں تواتر کے ساتھ شرکت کرتا رہا ہوں۔ ان مشاعروں میں طبعزاد کے ساتھ ساتھ ترجمہ کیے ہوئے ہائیکو بھی صحیح وزن میں پیش کیے جاتے

تھے۔''۵۱

اگر محسن بھوپالی کے اس اقتباس کا تجزیہ کیا جائے تو پہلی بات وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ سندھی زبان میں شائع تنویر عباس کے ہائیکو سے سب سے پہلے متعارف ہوئے۔ ممکن ہے کہ وہ اس سے قبل ہائیکو سے نہ واقف ہوں لیکن اس سے قبل اردو میں کافی ہائیکو شائع ہو چکے تھے۔ پھر انھوں نے ان ہائیکو کا سندھی سے اردو میں منظوم ترجمہ کر کے افکار کے مئی ۱۹۶۳ کے شمارے میں شائع کرایا۔ اور وہ اس بات کا دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ان ہائیکو کو پاکستان میں شائع ہونے میں اولیت حاصل ہے۔ وہ یہ بھی دعویٰ کر رہے ہیں کہ انھوں نے سندھی سے ان کا ترجمہ کیا تھا۔ سندھ پاکستان میں ہی ہے اس لیے پاکستان میں اولیت کا دعویٰ غلط ہے۔ اگر وہ اردو زبان کے پس منظر میں بات کر رہے ہیں تو اردو میں سب سے پہلے ۱۹۲۲ء میں شائع ہو چکے تھے یعنی ان کے ہائیکو سے تقریباً ۴۱ سال قبل۔ ہاں اگر ان کی مراد پاکستان بننے کے بعد پاکستان میں اردو میں تو ان کا دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے۔

اردو میں ہائیکو کو فروغ دینے والوں اور ہیئت و فن کے اعتبار سے اس صنف سخن کو اعتبار بخشنے والوں میں محسن بھوپالی کا نام سرفہرست ہے۔ درج بالا اقتباس میں جاپانی قونصل خانہ کراچی میں ہونے والے سالانہ مشاعروں کا بھی ذکر ہے۔ وہ بہت اہم ہے دراصل یہ جاپانی قونصل خانہ کی کوشش ہی ہے کہ اردو میں بڑی تعداد میں ہائیکو کہے جانے لگے اس سے قبل بس کبھی کبھی ہی کوئی ہائیکو کہتا تھا۔ چونکہ جاپان ایک امیر ملک ہے اور اس کے پاس وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے اس صنف کو فروغ میں کافی اہم حصہ لیا اور پاکستان کے بہت سے شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ اس کے بعد جاپان میں ہائیکو کا ایک سلسلہ چل پڑا اور آہستہ آہستہ یہ ایک پورا کارواں بن گیا۔ جس میں بے شمار شاعر جمع ہو گئے۔ خالص ہائیکو پر مبنی ایک رسالہ ''ہائیکو انٹرنیشنل'' (سہ ماہی) بھی شائع کیا گیا۔ اس رسالے کی جانب سے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہائیکو کے فروغ کے لیے مقابلوں کا بھی انعقاد کیا گیا۔ اس طرح سے

اردو میں اس صنف کو بہت فروغ دیا گیا۔ لیکن ان سب کے باوجود ابھی بھی اس صنف کو وہ اہمیت نہیں ملی ہے جو مثلاً غزل، نظم، آزاد نظم، نثری نظم وغیرہ کو حاصل ہے۔ مستقبل اس کی صورت کیا ہوگی یہ تو مستقبل ہی طے کرے گا لیکن یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں ہائیکو کا ایک کارواں تو بن چکا ہے۔

جہاں تک محسن بھوپالی کے ہائیکو کا سوال ہے انھوں نے سب سے پہلے ۱۹۶۳ء میں ہائیکو نگاری شروع کی تھی۔ اور ان کے مجموعوں میں سب سے پہلے گرد مسافت میں ہائیکو شامل کیے گئے۔ یہ مجموعہ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں بیس طبع زاد اور چودہ ترجمہ شدہ ہائیکو ہیں۔ محسن بھوپالی کے ان ہائیکو کو پڑھ کر جو سب سے پہلا تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ محسن بھوپالی کے ہائیکو، نہ صرف دوسرے ہائیکو نگاروں کی شاعری سے مختلف ہیں بلکہ خود ان کی دوسری اصناف کی شاعری سے کافی مختلف ہیں۔ ان کی اس انفرادیت کی سب سے پہلی اور شاید سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ یہ ہائیکو سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل کے بارے میں نہیں ہیں یا بہت کم ہیں۔ یہ ہائیکو بہت حد تک ان کے ذاتی احساسات کو بیان کرتے ہیں۔ یہاں ان کی فکر بہت دبی دبی ہے اور فن واضح طور پر ابھر کر آیا ہے۔ ان کے ہائیکو میں جمالیاتی ذوق بھی خوب ابھر کر آیا ہے۔

آتے جاتے دن
جب سے نظریں پھیری ہیں
صحرا ہیں تجھ بن

باز آؤ گا جا
مجھ کو پھر تو سمجھانا
اس سے مل کر آ

کیسا تھا یہ خواب
روتا تھا اک ماہی گیر
مچھلی تھی بے آب

ان ہائیکو کو پڑھ کر ایک الگ طرح کی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ پہلے ہائیکو میں ہجر کی بات کہی گئی ہے اردو شاعری میں یہ کوئی نئی بات نہ سہی ہجر پر بے شمار اشعار اردو شاعری میں کہے گئے ہیں لیکن یہاں ایک الگ طرح کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ یہ کیفیت پیدا کرنے کے لیے ایک خاص تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ وہ تکنیک یہ ہے کہ اس میں پہلے مصرعہ میں ایک بات کہی گئی ہے اس کے بعد جب دوسرا مصرعہ آتا ہے تو دونوں مصرعوں کا ربط سمجھ میں نہیں آتا ہے لیکن جب تیسرا مصرعہ آتا ہے تب پہلے اور دوسرے مصرعہ کا ربط بھی سمجھ میں آتا ہے اور پورا ہائیکو بھی سمجھ میں آجاتا ہے اور یہ ہائیکو بہت موثر بھی ہے۔ یہاں ابہام کی ایک دھندسی چھائی ہوئی ہے۔ جو غور وفکر اور معنی کی تلاش کی دعوت دیتی ہے۔

محسن بھوپالی نے ان تینوں ہائیکو میں یہی تکنیک استعمال کی ہے بلکہ ان کے بیشتر ہائیکو میں یہی تکنیک ہے اور محسن بھوپالی کی ہائیکو نگاری کی یہ ایک خاص شناخت بنتی ہے۔ دوسرے ہائیکو کی ایک خاص بات یہ بھی ہے مکالمے کے ذریعے بات کہی گئی ہے۔ ویسے تو شاعری میں مکالمے کا استعمال کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن جہاں ابہام کی فضا ایسی گہری ہو، وہاں مکالموں کا استعمال بہت مشکل اور غیر معمولی ہوجاتا ہے ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

تیسرے ہائیکو میں ابہام کی فضا اور بھی گہری ہے۔ وہ ماہی گیر کیوں رورہا تھا؟ مچھلی بے آب کیوں تھی؟ یہ مچھلی اپنا الگ وجود رکھتی ہے یا ماہی گیر کے رونے کا استعارہ ہے؟ اور یہ خواب کون دیکھ رہا ہے۔ ہائیکو کا راوی؟ یا ماہی گیر؟ اس طرح پورے ہائیکو میں ابہام کی ایک ایسی فضا ہے جو شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے۔ اگر مچھلی ایک استعارہ ہے تو ماہی گیر سے اس کی رعایت بہت خوب ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے ہائیکو میں موسم یا اس کے تلازمات کا ذکر عام طور پر لازمی مانا جاتا ہے۔ محسن بھوپالی نے بھی اس روایت کو جاری رکھا ہے وہ کسی نہ کسی طور پر موسم کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ وہ چاہے براہ راست ہو یا بالواسطہ۔ کبھی کبھی علامتوں یا

استعاروں میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔

بوجھل بوجھل شام
سہمے سہمے پتے ہیں
کیا دیں رت کو نام

بوندیں برسی ہیں
بجلی طنزاً کہتی ہے
باہیں خالی ہیں

محسن بھوپالی کے ہائیکو کا دوسری مجموعہ ''منظر پتلی میں'' ہے جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ محسن بھوپالی کا پہلا ایسا مجموعہ تھا جو خالص ہائیکو پر مبنی تھا اگر چہ اس سے قبل بھی اردو میں ہائیکو کے مجموعے شائع ہو چکے تھے لیکن اردو میں ہائیکو کی تاریخ میں یہ ایک بہت اہم مقام تھا۔ اس سنجیدگی اور ایسی خلاقی سے اردو میں ہائیکو کا مجموعہ اس سے قبل نہیں شائع ہوا تھا۔ اور اس کا بہت غیر معمولی طور پر استقبال بھی کیا گیا۔ اس مجموعے میں تقریباً سو طبعزاد ہائیکو اور بڑی تعداد میں تراجم بھی ہیں۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں ایک اور جاپانی صنف واکا میں بھی طبع آزمائی کی گئی ہے اس مجموعے میں واکا کی تعداد چھ ہے۔

یہ مجموعہ چونکہ پورے طور پر ہائیکو کا ہے تو اس کا مطالعہ اپنے قاری کو ایک الگ احساس سے واقف کراتا ہے۔ اس کے مطالعے سے جو تاثر قائم ہوتا ہے وہ ہمیں ایک الگ دنیا میں لے جاتا ہے۔ قدرت کی نزاکتو اور فطرت کی باہوں میں ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ خاص طور سے آج کی شہری زندگی نے فطرت کے بے حد حسین اور دلکش دنیا کو بھلا دیا ہے اور ہم مصنوعی و غیر فطری زندگی کے جس طرح سے عادی ہو گئے ہیں، محسن بھوپالی کے ہائیکو اس فطری دنیا میں لے جانے کا کام کرتے ہیں۔ ان کو پڑھتے وقت کئی بار ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہم کئی سو برس پہلے کے زمانے میں پہنچ گئے ہیں۔ اگر شاعری انسانی زندگی کے ارتقا کے کسی خاص مقام پر لے جانے کا احساس دلا

دے تو یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہوتا ہے۔ چند ہائیکو پیش ہیں جن پر آج کی زندگی کے مسائل کا سایہ بھی نہیں پڑ رہا ہے۔

جھرنے کی آواز
دل میں پیدا کرتی ہے
جینے کا احساس

اس چوٹی کے پاس
وہ بادل ہے یا کہ دھواں
میری کٹیا پر

لمبی کالی رات
تارے گننے والی آنکھ
بے موسم برسات

کہیں کہیں پر محسن بھوپالی نے ہائیکو میں قافیہ کا بھی اہتمام کیا ہے اور کہیں کہیں ردیف و قافیہ دونوں کا۔ جہاں جہاں قافیہ یا ردیف و قافیہ دونوں کا استعمال کیا ہے۔ وہاں بے ساختہ اردو شاعری کی سب سے مشہور و مقبول صنف سخن غزل یاد آ جاتی ہے۔ لیکن ہائیکو کا پوری غزل سے تقابل نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ اگر ہائیکو کا غزل کے ایک شعر سے تقابل کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ہر ہائیکو دوسرے ہائیکو سے بالکل آزاد ہوتا ہے جب کہ غزل کے اشعار معنی کے لحاظ سے تو آزاد ہوتے ہیں لیکن صوتی نظام میں وہ بحر، ردیف اور قافیہ سے باہمی طور پر منسلک رہتے ہیں۔ لیکن غزل کا اصل کمال اس ایجاز و اختصار سے علامتوں، استعاروں اور تشبیہات کا استعمال ہے۔ یہ خوبیاں اچھے ہائیکو نگار شاعروں میں بھی پائی جاتی ہیں، اگر چہ اردو اور فارسی میں اس کے جتنے امکانات کا استعمال کیا گیا ہے شاید اردو ہائیکو میں تو کیا جاپانی ہائیکو میں ابھی اتنے امکانات کو استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن شعر اور ہائیکو میں رشتہ تو ضرور قائم ہو جاتا ہے۔ اردو میں ہائیکو کے لیے امکانات بنیاد تو بن جاتی ہے۔

روشن تھیں راتیں
یوں لگتا ہے اب جیسے
خوابوں کی باتیں

مہنگی بکتی ہے
وہ مچھلی جو دریا میں
الٹی بہتی ہے

پتوں کی تالی
سن کر بن میں چونک اٹھا
محسن بھوپالی

منظر پتلی میں مجموعے کی اشاعت کو اردو ہائیکو کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ مانا جاتا ہے جب یہ مجموعہ شائع ہوا تو کھلے دل سے اس مجموعے کا استقبال کیا گیا اس مجموعے نے اردو میں ہائیکو کے مزاج کو طے کر دیا اس مجموعے میں دیباچے کے طور پر محسن بھوپالی کا ہائیکو کی ہیئت اور مزاج پر جو مضمون ہے اس نے بھی ہائیکو کے تئیں جو ابہام تھے ان سب کو ختم کر دیا۔ محمد امین جو خود ہائیکو کے اہم شاعر ہیں اور اردو میں ہائیکو کا مجموعہ شائع کرانے والے وہ پہلے شخص ہیں، انھوں نے ۱۹۸۱ء میں اردو میں ہائیکو کا پہلا شعری مجموعہ شائع کرایا تھا۔ وہ محسن بھوپالی کے اس مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''''منظر پتلی میں'' محسن بھوپالی کی ہائیکو شاعری کا اہم مجموعہ ہے۔ جسے رجحان ساز مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ پتلی اور ہائیکو کی مماثلت بھی خوبصورت ہے۔ جس طرح چھوٹی سی پتلی انگنت اور بے شمار دیکھتی ہے۔ اسی طرح مختصر صنف شاعری ہائیکو اپنے اختصار میں لاتعداد منظر پیش کرتی ہے۔ ''منظر پتلی میں'' میں قاری ان مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ہائیکو کے شائع شدہ مجموعوں کے تناظر

میں یہ ایک اہم اور قابلِ ذکر مجموعہ ہے جو اپنے شعری محاسن کے
ساتھ ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے۔''۵۲

محسن بھوپالی کا خالص ہائیکو کا دوسرا اور مجموعی طور پر ہائیکو کا تیسرا مجموعہ ''چیری سے چنبیلی تک'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں تقریباً ۵۷ طبعزاد ہائیکو اور بڑی تعداد میں تراجم بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ترجمہ اور طبعزاد واکا بھی ہیں۔ چیری سے چنبیلی شائع ہونے سے پہلے ہی محسن بھوپالی کا شمار ہائیکو نگاری کے اہم ترین شعرا میں شمار کیا جارہا تھا ''ہائیکو انٹرنیشنل'' ان پر ۱۹۹۹ء میں ایک خصوصی شمارہ شائع کر چکا تھا۔ جس کے بیشتر مضامین میں ان کی ہائیکو نگاری سے ہی بحث کی گئی تھی۔ ''چیری سے چنبیلی تک'' کی اشاعت نے انھیں ہائیکو شاعری کا مزید محترم شاعر بنادیا۔

پھول چنبیلی کے
چیری کے گلدستے میں
اچھے لگتے ہیں

کاٹا جب امرود
مجھ سے پہلے کھانے کو
کیڑا تھا موجود

ہائیکو کی ہیئت
دل کی دھڑکن ہو جیسے
ہوں محوِ حیرت

دیکھو پروانے
آپس میں کب جلتے ہیں
مل کر مرتے ہیں

محسن بھوپالی نے منظر تِتلی میں ہائیکو کا جو مزاج و معیار قائم کر لیا تھا وہ چیری سے چنبیلی تک میں بھی جاری رہا بلکہ اس میں موضوعات کا مزید تنوع ملتا ہے۔ فنی اعتبار

سے اس مجموعے میں پہلے کے مقابلے تھوڑی سادہ بیانی زیادہ نظر آتی ہے۔ وہ ابہام جو ان کے ابتدائی اور منظر پتلی میں تھا اب اس کی دھند بھی تھوڑی کم نظر آتی ہے۔

اردو ہائیکو میں محسن بھوپالی کا مقام بہت بلند ہے، وہ اس صنف کے سب سے بڑے معماروں میں ہیں۔ سہیل احمد صدیقی محسن بھوپالی کے ہائکو کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"Mohsin Bhopali is the pioneer of Urdu Haiku. May be some Pakistani poets would not agree to this statement; but a fact finding study would prove it easily....There could be debate on the form and format, but to tell you the trueth, Mohsin is the engineer of Haiku, no matter they are 53original or translation."

اس اقتباس سے واضح ہے کہ سہیل احمد صدیقی محسن بھوپالی کو ہائیکو کے معمار بھی ہیں اور اس کا مزاج و شکل وصورت کا تعین بھی انھوں نے ہی کیا ہے۔ پروفیسر احمد علی نے محسن بھوپالی کی ہائیکو نگاری خاص طور سے انھوں نے جاپانی کی آوازوں اور وہاں کے اوزان کو ذہن میں رکھتے ہوئے اردو کے جن اوزان کو وضع کیا ہے اس کے بارے میں لکھا ہے۔

''اب تک لکھے جانے والے ہائیکو نمونوں سے ظاہر ہوتا ہے صرف محسن بھوپالی اس میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں اوروں نے اپنے ''ہائیکو'' میں اردو کے ہی اوزان کو سامنے رکھا ہے۔''۵۴

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ محسن بھوپالی نے ہائیکو نگاری کے ذریعے اپنے تخلیقی

فلک کو اور وسعت دی ہے۔ ان کے اپنے تخلیقی اظہار میں ہائیکو کی بہت اہمیت ہے ساتھ ہی وہ اردو میں ہائیکو کے اہم ترین شعرا میں شامل ہیں۔

واکا:

ہائیکو کی طرح واکا بھی جاپان کی ایک بہت اہم صنف سخن ہے۔ یہ صنف ایک اور جاپانی صنف تنکا سے بہت ملتی جلتی ہے بلکہ اب دونوں اصناف کا انضمام ہو چکا ہے۔ اس صنف کی ہیئت اور مزاج کے بارے میں کودنشا انسائکلو پیڈیا آف جاپان میں جو لکھا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے قصیدہ سے غزل الگ صنف بن گئی ہے اسی طرح ہائیکو واکا سے نکلی ہے اور یہ تقریباً چودہ سو برس پرانی صنف سخن ہے۔

> ''واکا کی اصطلاح اپنے وسیع معنوں میں کلاسیکی جاپانی شاعری کی اس روایتی صنف سخن کے لیے مخصوص ہے جو گذشتہ چودہ سو برسوں میں مختلف ہیئت اختیار کرتی رہی ہے۔ یہ صنف سخن ۳۱ رکن تہجی (Syllable) ۷-۷-۵-۷-۵ کی ترتیب کے ساتھ پانچ مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس طور پر یہ کلاسیکی صنف سخن تنکا سے مماثلت رکھتی ہے۔ واکا کی پہلی صفت اس کی عروضانہ صداقت ہے جو کہ اسے جاپانی زبان کی خاصیت کی وجہ سے حاصل ہے اس کا دوسرا امتیاز انسانی جذبات، احساسات اور ذہنی کیفیات کی نغمگی کے ساتھ ترجمانی ہے۔ واکا کی ایک اور صفت اس کے مواد اور موضوع کا اپنے معاشرے سے مربوط ہونا ہے مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ واکا کا تمام تر سماجی اور بعض اوقات کسی واقعہ یا منظر کا نغمہ کی شکل میں اظہار یا فطرت کے کسی مشاہدے یا انسانی رشتوں اور معاملات کے ابلاغ کا ذریعہ ہے۔''[۵۵]

اس تعریف میں موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے واکا کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اور کسی حد تک واکا کی تعریف طے ہو جاتی ہے۔ اس

تعریف اس کے اوزان کے بارے میں واضح معلومات تو حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہائیکو کے مقابلے اس صنف میں زیادہ وسعت ہے۔ بحر و اوزان کے لحاظ سے بھی اور موضوعات کی آزادی کے لحاظ سے بھی لیکن اس کے باوجود اردو میں ہائیکو کے مقابلے میں واکا نظمیں بہت کم کہی گئی ہیں۔ محسن بھوپالی کے مجموعے ''منظر پتلی میں'' صرف چھ واکا ہیں، جو سبھی طبعزاد ہیں۔ چیری سے چنبیلی میں کل آٹھ طبعزاد واکا ہیں جن میں سے پانچ پاک جاپان دوستی کی گولڈن جوبلی کے موقعے پر جاپان قونصل خانہ کے ذریعہ منعقد ہونے والے واکا راگ میں گانے کے لیے لکھے گئے جب کہ باقی تین پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقعے پر لکھے گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ لکھے نہیں گئے بلکہ لکھوائے گئے۔ مثال کے طور پر چند واکا پیش ہیں۔

اک مدت کے بعد
اس کے گھر سے آئے ہوئے
خط کے کونے پر
ہلدی کی کچھ چھینٹیں ہیں
میں ہوں بھیگی پلکیں ہیں (منظر پتلی میں ۵۳)

وہ تھی الہڑ نار
آخر اس نے بھی دیکھا
جسموں کا بازار
ہے ماضی کا پچھتاوا
اب اس کا کل سرمایہ (منظر پتلی میں ۵۴)

پھول چنبیلی کے
چیری کے گلدستے میں
اچھے لگتے ہیں
رنگوں کا یہ نیارا میل

رہے سدا یہ پیارا میل (چیری سے چنبیلی تک ص ۶۸)

نصف صدی کی بات
اپنی قوم نے کاٹی تھی
ڈیڑھ صدی کی رات
قربانی کا پھل پایا
آزادی کا دن آیا (چیری سے چنبیلی تک ص ۷۳)

''منظر پتلی میں'' کے دونوں واکا نہایت دلچسپ ہیں دونوں میں فراق اور غم کی ایک داستان چھپی ہوئی ہے اور اس میں شاعری کی اعلیٰ روایت کی پاسداری ملتی ہے۔ لیکن چیری سے چنبیلی کے واکا میں شاعری کی وہ اہمیت نہیں ہے بلکہ وہ ان خاص موقعوں کے لحاظ سے ہیں یہ دونوں واکا اس خاص موقوں کی بھر پور نمائندگی کرتے ہیں۔

(۵) منظوم تراجم

(جاپانی اور سندھی شعراء کے کلام کا منظوم ترجمہ وانتخاب)

محسن بھوپالی بنیادی طور پر ایک سیاسی و سماجی فکر کے تجربہ پسند شاعر ہیں انھوں نے ہیئت کے اعتبار سے کافی تجربہ کیے ہیں۔ قطعہ اور ہائیکو جیسی کم مقبول اصناف میں بڑی یکجوئی کے ساتھ طبع آزمائی کی اور دونوں اصناف میں محسن بھوپالی ایک بڑا نام ہے۔ جب کہ نظمانے نام سے ایک نئی صنف کی طرح بھی ڈالی ہے۔ محسن بھوپالی کے تراجم کو اسی پس منظر میں دیکھنا ہوگا۔ ان کی تجربہ پسند طبیعت نے انھیں منظوم تراجم کی طرف بھی راغب کیا۔ ان کے تراجم کی دو بنیادی باتیں ہیں اول یہ سارے تراجم منظوم ہیں اور دوسری بات یہ کہ ان کے سارے تراجم جاپانی اصناف ہائیکو اور واکا میں ہی ہیں۔ محسن بھوپالی کے تراجم کو ترجمہ کے فن اور اس کی روایت کے

تناظر میں دیکھنا بہت زیادہ کارگر نہیں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ کسی شاعری کا منظوم ترجمہ کبھی بھی ترجمہ کے اصولوں کے اعبار سے بہت پسندیدہ فعل نہیں مانا گیا ہے۔ جب بھی منظوم ترجمہ کیا گیا ہے چاہے جتنی ایمانداری سے کیا گیا ہو اکثر یہ ہوا ہے کہ وہ ترجمہ کم رہ جاتا ہے اور اس کی حیثیت تخلیق کی ہو جاتی ہے۔

محسن بھوپالی نے ہائیکو نگاری کا آغاز ترجمہ سے ہی کیا تھا شروع میں انھوں نے تنویر عباس کے سندھی ہائیکو کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں محسن بھوپالی خود رقم طراز ہیں۔

''جاپانی صنف سخن ہائیکو سے میں ڈاکٹر تنویر عباس کے سندھی ہائکو کے ذریعے متعارف ہوا تھا۔ تنویر کے چند ہائیکو کا میں نے اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا جو ماہنامہ ''افکار'' کراچی کے مئی ۱۹۶۳ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے۔''۵۶

بعد میں یہ ہائیکو ان کے مجموعے ''منظر پتلی میں'' میں بھی شامل کے گئے۔ اردو اور سندھی دونوں زبانوں میں اس وقت ہائیکو کی ہیئت کا تعین نہیں ہو سکا تھا۔ ہائیکو سے محسن بھوپالی کا یہ پہلا تعارف تھا لیکن انھیں اس صنف نے متاثر کیا تھا اسی لیے انھوں نے ان ہائیکو کا ترجمہ کیا۔ بعد میں انھوں نے جاپانی ہائیکو کا وسیع مطالعہ کیا اور اردو میں ہائیکو کی ہیئت کے تعین میں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ سندھی زبان سے کئے گئے ان ہائیکو کو محسن بھوپالی نے عنوان بھی دیا تھا۔ اس لیے یہ ہائیکو ایک طرح سے تین مصرعوں پر مبنی نظمیں تھیں۔ بہر حال سندھی زبان سے ترجمہ شدہ ہائیکو اس طرح ہیں۔

شاعر کا ذہن

ذہن میرا مثل چشم کائنات
جس سے میرے شعر اشکوں کی طرح
بہتے رہتے ہیں سدا، دن ہو کہ رات

تحفہ

کہکشاں کا راستہ میں کر کے طے
ٹھہر پیارے تیری خاطر لے تو آؤں
تحفۂ عقد ثریہ چرخ سے

قہقہے

خامشی میں یوں تھے تیرے قہقہے
جیسے شاخِ سبز پر گل ہائے سرخ
کھل اٹھے ہوں دیکھتے ہی دیکھتے

ان تینوں ہائیکو میں بعد کے ہائیکو کی طرح اوزان کا تعین نہیں ہے لیکن ان میں قافیوں کا اہتمام کیا گیا ہے اور تین مصرعوں کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ جہاں تک فکر وفن کا سوال ہے ان میں گہرائی و گیرائی بھی نہیں ہے جو بعد میں ملتی ہے۔ یہاں ہلکے پھلکے موضوعات کو منظوم کر دیا گیا ہے لیکن ان میں ایک چمک نظر آجاتی ہے جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس صنف میں امکانات بہت روشن ہیں۔ اس کے بعد محسن بھوپالی نے کچھ اور سندھی ہائیکو کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ان میں ہائیکو کی ہیئت بھی ہے اور ان کا کوئی عنوان بھی نہیں ہے۔ اور ان میں شاعری کی فنی خوبیاں بھی ہے، ترجمے میں طبعزاد ہائکو کی روانی بھی ہے۔

تھکا ہوا سا شخص
اور اک ویراں راہگزر
شب کا آخری پہر
دنیا لیا ہے ڈھول
جس میں سچ اک ذرہ ہے
جھوٹ ہے ڈھیروں ڈھیر

ان میں ہائیکو کی تمام صفات موجود ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ترجمہ

اچھا ہے اصل کے کافی قریب ہے چونکہ سندھی زبان اور اردو زبان کا کافی گہرا رشتہ ہے۔ لفظیات ایک جیسی ہیں، صوتی آہنگ ایک جیسا ہے، بحر و وزن کا طریقہ بھی تقریباً ایک جیسا ہے اس لیے ترجمہ کرنا آسان بھی ہے اور اصل کی خوبیاں بھی برقرار رہ سکی ہیں۔

محسن بھوپالی نے سندھی کے بعد جاپانی ہائیکو کی طرف توجہ دی۔ اس کے بعد وہ تاحیات صرف جاپانی شاعری کا ہی ترجمہ کرتے رہے پہلے صرف ہائیکو کا پھر کچھ واکا کا بھی ترجمہ کیا۔ جاپانی شاعروں میں محسن بھوپالی نے باشو، بوساں، اسا، شکی اور سونو اوچی دا کے تراجم خاص طور سے پیش کیے ہیں۔ یہ جاپانی ہائیکو کے عظیم ہائیکو نگار ہیں۔ جاپانی ہائیکو کی انھیں سے شناخت بنتی ہے۔ محسن بھوپالی نے انگریزی سے ہی سارے ترجمے کیے ہیں۔ لیکن ترجمہ سے پہلے انھوں نے جاپانی تہذیب کو گہرائی سے سمجھا ہے ان کی طرز حیات کو سمجھا ہے۔ پھر جاپانی شاعری کی روایت خاص طور سے جاپانی ہائیکو نگاری کو انھوں نے بہت گہرائی سے مطالعہ کیا، اس پر سیر حاصل گفتگو بھی کی اور اردو میں ہائیکو کس طرح موثر ہو سکتے ہیں اس پر بھی غور وفکر کیا۔ اس کے بعد ہی ترجمہ کیے ہیں۔ یہ ترجمے ایسے نہیں ہیں کہ کسی ہائیکو نے متاثر کیا اور اسے اپنی زبان میں منتقل کرنے بھر کا عمل نہیں ہے۔

گرد مسافت میں ۱۴ ترجمہ شدہ ہائیکو ہیں۔ ان میں سے پانچ ہائیکو باشو کے، تین رانتسو کے، دو زین کے اور ایک ایک ہائیکو ایسا، کوکیو، شیشی اور کوئی کا ہے۔ قارئین کی آسانی کے لیے سبھی کے اصل انگریزی متن کو بھی ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہی اس میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جس سے تقابل میں بھی آسانی رہے۔ وگرنہ پہچاننا مشکل ہوتا کہ کون سا ترجمہ کس ہائیکو کا ہے۔ کیونکہ ہائیکو کا کوئی عنوان نہیں ہوتا ہے اور سبھی ہائیکو کا بنیادی موضوع بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ ان میں سے چند ہائیکو پیش کیے جا رہے ہیں۔

HOW THEY PULL THE

HEART STRINGS

COMING ALONG THE

MOUNTAIN ROADS

THESE VIOLETS

کوہ کے رستے پہ

دل کی ڈوری کھینچتے ہیں

پھول بنفشہ کے (باشو)

A WORLD OF GRIEF AND

PAIN

FLOWER BLOOMS

EVEN THEN

دنیا غمگیں ہے

کھلتے پھولوں کے دم سے

پھر بھی رنگیں ہے (زین)

I grow lacks

lonely,

In the world of dreams

میں نے تنہا بوئے

خوابوں کی اس دھرتی میں

پودے خوشبو کے (کوئی)

ان ترجموں کے مطالعے سے جو باتیں سب سے پہلے ذہن میں آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ محسن بھوپالی نے جس کو اصل متن 'مان' کر ترجمہ کیا ہے وہ دراصل متن ہے نہیں، کہنا مشکل ہے کہ خود ان انگریزی ہائیکو میں جاپانی ہائیکو کی کتنی روح اور کتنا جسم آ پایا ہے۔ رہی بات کہ جو بھی انگریزی متن ہمارے پاس ہے اس کو صحیح مان کر اس کے ترجمہ کا اگر جائزہ لیا جائے تو سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ انگریزی متن میں ۵۔۷۔۵

ارکان کی ترتیب کا اہتمام بھی نہیں کیا گیا ہے۔اور یہ متن منظوم بھی نہیں ہے۔اب نثری آہنگ کے متن کا منظوم ترجمہ کرنا بڑا مشکل کام ہے جو بہت کم لوگ ہی کامیابی سے کر سکے ہیں۔منظوم آہنگ کا نثری آہنگ میں ترجمہ تو عام بات ہے لیکن اس کے برعکس بہت کم ہی ہوتا ہے۔

اگر کوئی جاپانی زبان جاننے والا ان جاپانی ہائیکو سے محسن بھوپالی کے اردو تراجم کا تقابل کرے تو بڑی دقت ہوگی۔ پہچاننا مشکل ہوگا کہ یہ ترجمہ ہیں یا محض دو شاعروں کے خیال ٹکرا گئے ہیں۔ یہاں اس بات کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ محسن بھوپالی نے ترجمہ اچھے نہیں کیے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ یہ ترجمہ کم ہیں بلکہ ہائیکو کو پڑھ کر ان سے ایک خیال لے کر اپنے ہائیکو تخلیق کیے ہیں۔انگریزی اور اردو متن کا تقابل کرنے پر لگتا ہے کہ کہیں کچھ چھوٹ گیا ہے، کہیں کچھ بڑھ گیا ہے۔اگر منظوم ترجمہ اور مخصوص بحر و ارکان کا اہتمام کرتے ہوئے ترجمہ کرنا ہے تو یہ مسئلہ درپیش رہے گا ہی اس سے مفر ہے ہی نہیں۔

منظر تِتلی میں اور چیری سے چنبیلی تک محسن بھوپالی کے دو شعری مجموعے ایسے ہیں جن میں صرف ہائیکو اور واکا ہیں، طبعزاد اور ترجمے دونوں۔منظر تِتلی میں بیس ہائیکو باشو کے ترجمہ کیے گئے ہیں، ساتھ ہی اس میں باشو کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بوسون کے چھبیس ہائیکو کا ترجمہ اس کے تعارف کے ساتھ کیا ہے۔اس کے بعد ایسا کا کا تعارف ہے اور اس کے ۴۱ ہائیکو کا ترجمہ کیا ہے اس کے بعد ماساوکا شیکی کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور اس کے گیارہ ہائیکو کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد سونو اوچی دا کے ۱۹ ہائیکو ترجمہ کیے گئے ہیں۔اس طرح اس مجموعے میں ۱۱۷ ہائیکو کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔دوسرے مجموعے چیری سے چنبیلی میں واکا زیادہ ترجمہ کیے گئے ہیں ہائیکو صرف ۲۲ ہیں۔

محسن بھوپالی کا ہائیکو کی اتنی بڑی تعداد کا اردو میں ترجمہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے ترجمے وقتی دلچسپی نہیں تھی بلکہ پوری سنجیدگی کے ساتھ انھوں نے اس کام

کا بیڑا اٹھایا تو اسے کافی دور تک لے گئے۔اب چند ہائیکو اور ان کے ترجموں پر ایک نظر ڈالتے ہیں کہ ان کے اصل خالق کی ہائیکو شاعری کیسی تھی؟ اور ان کا ترجمہ کیسا ہوا ہے؟ پہلے دو ہائیکو ''منظر تیلی میں'' سے پیش ہیں۔

I met a coffin

At mid - night

!n the new year

آدھی رات کے وقت
نئے سال کی آمد پر
دیکھی اک میت
شیکی

The man who says

"My children are a burden"

There are no flowers for him

بچوں سے بیزار
کب ہوتا ہے ایسا شخص
پھولوں کا حق دار
باشو

اگر ان دونوں کے ترجموں کا تجزیہ کیا جائے تو پہلے ہائیکو میں انگریزی میں I met a coffin کا 'دیکھی اک میت' ترجمہ پوری نمائندگی نہیں کرتا انگریزی میں جو برجستگی ہے وہ بات دیکھی اک میت سے ادا نہیں ہو پاتی ہے۔اسی طرح دوسرے ہائیکو میں "My children are a burden" والی بات بچوں سے بیزار سے ادا نہیں ہو پاتی ہے۔انگریزی کی مکالماتی فضا بھی اردو ترجمہ میں نہیں آسکی ہے۔ انگریزی میں جو بات دو مصرعوں میں کہی گئی تھی اسے اردو میں ایک ہی مصرعے میں کہا گیا ہے۔اسی طرح انگریزی میں آخری مصرعہ میں جو بات کہی گئی تھی اسے اردو میں دو مصرعوں میں ادا کیا گیا ہے۔ اس طرح اگر ان ہائیکو کا اس طرح ترجمہ کے اصولوں

کے تحت تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا تو ان میں بہت سی کمیاں محسوس ہوں گی۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ مسئلہ منظوم ترجمہ کا ہے۔

اب چند ہائیکو ''چیری سے چنبیلی تک'' سے دیکھیے۔

Seaweed:

In the hollow of he rocks,

The forgotten tide.

گزرا ہے طوفان

پتھر کے سوراخوں میں

الجھی بحری گھاس رانستسو

Together with an old friend

Eating dried euthlefish

And talking of the past

مچھلی کی دعوت

دیرینہ ساتھی اور میں

ماضی کی باتیں ٹونیڈا اسلوکا

یہاں بھی وہی مسئلہ درپیش ہے اول تو ترجمہ مصرعہ در مصرعہ نہیں ہے، ترجمے میں مصرعے اصل متن سے آگے پیچھے کر دیے گئے ہیں۔ کئی بار معنی کی نمائندگی پوری نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً مچھلی کی دعوت میں Eating dried euthlefish والی بات ادا نہیں ہو پاتی ہے۔ انگریزی میں dried اور past میں جو مناسبت ہے وہ یہاں اردو میں نہیں آ سکی ہے۔ یہ مسئلہ محسن بھوپالی کی ناکامی کا نہیں ہے بلکہ منظوم ترجمہ کرنے کا ہے اور وہ بھی ایسی صنف میں جس میں پوری کائنات صرف ۱۷ ارکان میں ہی سمٹی ہوئی ہو، اس سے بہتر نتائج کی امید کرنا بے معنی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ منظوم کی بجائے نثری ترجمہ کرتے تو کیا بہتر نتائج سامنے آتے؟ ممکن ہے ترجمہ اچھے

ہو جاتے لیکن شاعری مر جاتی۔

محسن بھوپالی کی ہائیکو نگاری کے ان ترجموں کو اگر تخلیقی ترجمہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا اور ان کا جائزہ بھی اسی تناظر میں لینا چاہیے، شاید یہی وجہ ہے کہ محسن بھوپالی کے ہائیکو پر بہت سے مضامین لکھے گئے اور کے تراجم کا ذکر بھی ہے لیکن کسی نے ان کے تراجم کا ترجمہ کے اصولوں کے تحت جائزہ نہیں لیا ہے۔ ان ترجموں میں بنیادی طور پر محسن بھوپالی نے جاپانی شاعر کے ہائیکو پڑھ کر اسے اپنی زبان میں، اپنے آہنگ کے مطابق اسے ایک آزاد فضا میں نظم کیا ہے۔ اور انھیں اسی طور پر دیکھا جائے تبھی ہم صحیح نتائج پر پہنچ سکیں گے اور اس کی قدر ومنزلت کر سکیں گے۔

حوالہ جات:

نظم:

۱۔ محسن بھوپالی، پیش لفظ، موضوعاتی نظمیں، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۹۳، ص: ۱۱

۲۔ محسن بھوپالی، نغمہ، مطبوعہ ماہنامہ بچپن، جون ۱۹۴۹ء

۳۔ محسن بھوپالی، لمحۂ فکریہ، موضوعاتی نظمیں، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۹۳، ص: ۱۹ و ۲۰

۴۔ محسن بھوپالی، زمانہ الیکشن، پندرہ روزہ نمکدان، کراچی ۲۳ مارچ تا ۱۲ اپریل، ۱۹۵۴

۵۔ محسن بھوپالی، میرا اسکول، روزنامہ جنگ، کراچی، ۳ مئی ۱۹۵۱ء

۶۔ محسن بھوپالی، زمانہ الیکشن، موضوعاتی نظمیں، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۹۳، ص ۱۲

۷۔ محسن بھوپالی، شکست شب، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۸۹، ص ۱۰

۸۔ محسن بھوپالی، شکست شب، پیش لفظ، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۸۹، ص: ۵، ۶

۹۔ سلطان جمیل نسیم، محسن بھوپالی شکست شب سے مجموعۂ سخن تک، ماہنامہ چہار سو اکتوبر ۱۹۹۲ء

۱۰۔ محسن بھوپالی، شکست شب، پیش لفظ، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۹، ص ۱۱

۱۱۔ محسن بھوپالی، شکست شب، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۹، ص ۵۴ تا ۵۶

۱۲۔ محسن بھوپالی، شکست شب، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۹، ص ۲۹، ۳۰

۱۳۔ محسن بھوپالی، ماجرا، ۸سی، محمد علی سوسائٹی، کراچی، ۱۹۸۱ء ص ۱۲۳/۱۲۴

۱۴۔ محسن بھوپالی، ماجرا، ۸سی، محمد علی سوسائٹی، کراچی، ۱۹۸۱ء ص ۱۵۱/۱۵۲

۱۵۔ محسن بھوپالی، ماجرا، ۸سی، محمد علی سوسائٹی، کراچی، ۱۹۸۱ء ص ۱۲۹

۱۶۔ محسن بھوپالی، مجموعۂ سخن رگرد مسافت، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۸ء ص: ۵۲۶/۵۲۷

۱۷۔ محسن بھوپالی، مجموعۂ سخن رگرد مسافت، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۸ء ص: ۵۳۰/۵۳۱

۱۸۔ محسن بھوپالی، مجموعۂ سخن رگرد مسافت، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۸ء ص ۵۳۷

۱۹۔ محسن بھوپالی، روشنی تو دیے کے اندر ہے، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۶ء ص: ۶۷/۶۸

۲۰۔ ثاقب محسن، شہر آشوبِ کراچی، عرض ناشر، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۹ء

۲۱۔ محسن بھوپالی، شہر آشوبِ کراچی، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۹ء ص ۱۴

۲۲۔ محسن بھوپالی، شہر آشوبِ کراچی، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۹ء ص ۱۵

۲۳۔ محسن بھوپالی، شہر آشوبِ کراچی، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۹ء ص ۱۸

۲۴۔ محسن بھوپالی، منزل، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۲۰۰۳ء ص ۹۹/۱۰۰

۲۵۔ محسن بھوپالی، منزل، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۲۰۰۳ء ص ۹۴/۹۵

۲۶۔ ممتاز حسین، شکست شب (محسن بھوپالی) فلیپ طبع اول (۱۹۶۱ء) ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی ۱۹۸۹ء

۲۷۔ نزہت انیس، محسن بھوپالی شخصیت وفن، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلرز، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص: ۶۱

قطعہ:

۲۸۔ ڈاکٹر ظہیر رحمتی، غزل کی تنقیدی اصطلاحات، ۱۶۰، اترا کنڈ، جے این یو، نئی دہلی، ۲۰۰۵، ص ۳۹۱، ۳۹۲

۲۹۔ احمد ندیم قاسمی، تاثرات، ماہنامہ اسپوتنک، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۰، ص ۴۵

۳۰۔ احمد ندیم قاسمی، تاثرات، جستہ جستہ رگرد مسافت، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۸

۳۱۔ محسن بھوپالی، شکست شب، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۸۹، ص ۱۰

۳۲۔ احمد ندیم قاسمی، تاثرات، جستہ جستہ رگرد مسافت، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۸

غزل:

۳۴۔ محسن بھوپالی، شکست شب کا پیش لفظ، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۸۹

۳۵۔ ممتاز حسین، شکست شب کا فلیپ، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۸۹

۳۶۔ محسن بھوپالی، ماجرا کا پیش لفظ، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۸۱

۳۷۔ محسن بھوپالی، گرد مسافت کا پیش لفظ، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۸۱

۳۸۔ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت و فن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، کراچی، ۲۰۰۲، ص ۹۷

۳۹۔ سحر انصاری، بیاض، لاہور، شمارہ ۵، مئی ۲۰۰۱، ص ۲۷

نظمانے:

۴۰۔ سحر انصاری، نظمانے کا دیباچہ، عوامی دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۵، ص ۱۲

۴۱۔ سحر انصاری، نظمانے کا دیباچہ، عوامی دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۵، ص ۱۳

۴۲۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، فلیپ نظمانے، عوامی دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۵

۴۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی، روشنی تو دیے کے اندر ہے، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص: ۷۰

۴۴۔ محسن بھوپالی، انٹرویو نیوز جدہ، ۲۱ جون، ۱۹۹۵ء

۴۵۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، دیباچہ روشنی تو دیے کے اندر ہے، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۶ء

ہائیکو:

۴۶۔ کودنشا انسائیکلوپیڈیا آف جاپان، بحوالہ ''ہائیکو کے بارے میں'' (محسن بھوپالی)، منظر تپلی میں، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰

۴۷۔ یاسودا، جاپانی ہائیکو، بحوالہ ''ہائیکو کے بارے میں'' (محسن بھوپالی)، منظر تپلی میں، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰

۴۸۔ کیوسی تا کابابا، جاپانی ہائیکو، بحوالہ ''ہائیکو کے بارے میں'' (محسن بھوپالی)، منظر تپلی میں، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱

۴۹۔ محسن بھوپالی، ''ہائیکو کے بارے میں'' منظر تپلی میں، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص: ۳

۵۰۔ پروفیسر احمد علی، بحوالہ منظر تپلی میں، پہلا صفحہ، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۶ء

۵۱ محسن بھوپالی، چیری سے چنبیلی تک کا پہلا صفحہ، کینوس کمیونکیشنس، کراچی، ۲۰۰۵ء

۵۲ محمد امین، محسن بھوپالی کی ہائیکو نگاری، بیاض، مئی ۲۰۰۱ء، ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان، ص: ۲۹

۵۳ سہیل احمد صدیقی، چیری سے چنبیلی تک، کینوس کمیونکیشن، کراچی، ص ۱۴۳ و ۱۴۴

۵۴ پروفیسر احمد علی، ماہنامہ افکار، کراچی، ستمبر ۱۹۸۵ء

۵۵ کودنشا انسائیکلوپیڈیا آف جاپان، بحوالہ ''ہائیکو کے بارے میں'' (محسن بھوپالی)، منظر تتلی میں، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۵۲

منظوم ترجمہ:

۵۶ محسن بھوپالی، دیباچہ چیری سے چنبیلی تک، کینوس کمیونکیشنس، کراچی، ۲۰۰۵ء ص ۱۴۳

محسن بھوپالی کی نثری خدمات

(۱) مضامین ومقالات

(۲) سفرنامے

(۳) انٹرویو

(۴) اخباری مضامین، وکاہیے، خاکے، رپورتاژ، پیش لفظ اور منظرنامے وغیرہ

(۱) مضامین ومقالات

محسن بھوپالی کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں لیکن انھوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو کسی قید میں باندھ کے نہیں رہا رکھا۔ چاہے سیاسی وسماجی جبر کے خلاف بولنا ہو یا تخلیقی اظہار کی بات ہو۔ اسی لیے محسن بھوپالی اس بات کی حقیقت کو مانتے ہوئے بھی کہ وہ بنیادی طور پر شاعر ہی ہیں انھوں نے نثر میں بھی اپنے باطن و خارج کے اظہار کے لیے کئی تجربے کیے۔ جس طرح سے محسن بھوپالی نے کئی شعری اصناف میں طبع آزمائی کی اسی طرح نثر میں بھی انھوں نے کئی اصناف میں لکھا ہے۔ محسن بھوپالی کی نثری اصناف میں مضامین و مقالات، سفرنامے، انٹرویو، اخباری مضامین، فکاہیے، خاکے، رپورتاژ، پیش لفظ اور منظرنامے وغیرہ شامل ہیں۔

محسن بھوپالی کی نثری اصناف میں تین اصناف کو زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ تین اصناف میں ہیں تنقید وتحقیق، سفرنامے اور انٹرویو۔ جس میں ان کی باقاعدہ کتابیں ہیں۔ محسن بھوپالی کے لیے ہوئے انٹرویوز کی کتاب ''قومی یکجہتی میں ادب کا کردار'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب ان انٹرویوز پر مبنی ہے جس میں محسن بھوپالی نے مختلف ادیبوں کے انٹرویو لیے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے انٹرویو بھی شائع ہو چکے ہیں جن میں مختلف ادیبوں اور صحافیوں نے محسن بھوپالی کے انٹرویو لیے ہیں۔ اس طرح محسن بھوپالی کے انٹرویوز پر گفتگو کرنے کے لیے دونوں طرح کے انٹرویوز پر غور کرنا ہوگا جس میں انھوں نے انٹرویوز لیے ہیں اور وہ بھی جب دوسرے لوگوں نے ان کے انٹرویو لیے ہیں۔ محسن بھوپالی کے سفرناموں کی کتاب ''حیرتوں کی سرزمین'' (سفرنامۂ امریکہ وکینیڈا) ۱۹۹۲ء میں شائع ہوتھی یہ کتاب سفر امریکہ وکینیڈا کے مستند اور دلچسپ کتاب ہے اور سفرناموں کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے۔ محسن بھوپالی کی تنقید وتحقیق کی کتاب ''نقد سخن'' ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی تھی، اس کتاب کے علاوہ بھی

محسن بھوپالی کے بہت سے تنقیدی و تحقیقی مضامین و مقالے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔

محسن بھوپالی کے تنقیدی مضامین و مقالات بیشتر شاعری اور شاعروں سے متعلق ہیں۔ ان کی تنقیدی کاوشوں کا آغاز ان کے پہلے شعری مجموعہ شکستِ شب سے ہوتا ہے جو انھوں نے اس مجموعے کے پیش لفظ کے طور پر لکھے تھے۔ اگرچہ ان تعارفی کلمات کا عنوان ''کچھ اپنے بارے میں'' ہے لیکن اس میں جن موضوعات پر بحث ہے، وہ ان کا تعارف نہ ہو کر شاعری کے بارے میں ان کا نظریہ ہے۔ وہ اس دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''فن حقیقت ہے اور اظہارِ
حقیقت ہے گناہ
سوچتا ہوں کہ گنہگار بنوں یا نہ بنوں
کوئی فنکار اگر اپنے ذہنی ارتقا، سماجی شعور اور نظریۂ
فن سے متعلق اپنے خیالات اور احساسات کا بغیر
کسی سہارے یا ترجمان کے اظہار کرے تو بات
زیادہ واضح ہو کر سامنے آ سکتی ہے اور اعتدال پسند
ذہن کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔''[۱]

محسن بھوپالی کے نثری بیان سے قبل پیش کردہ شعر میں اس بات کا اعتراف ہے کہ فن دراصل حقیقت کا بیان ہے اور حقیقت کے بیان کو جابروں نے گناہ قرار دیا ہے اب فن کار سوچ میں پڑے ہیں کہ وہ یہ گناہ کریں یا نہ کریں؟ لیکن ''اظہارِ حقیقت ہے گناہ'' لکھ دینا ہی ایک طرح سے حقیقت کا بیان ہو گیا ہے۔ جہاں تک نثری بیان کا تعلق ہے اس میں ایک طرح سے تفصیل کے ساتھ شعر کی وضاحت کی گئی ہے۔ شعر و ادب میں حقیقت کا بیان ہمیشہ سے بہت اہم رہا ہے اور بیشتر شعرا و ادیب حقیقت کے بیان پر زور دیتے رہے ہیں لیکن لفظ حقیقت کا تصور ادب میں کافی متنازع رہا ہے۔ اور

اس کے معنی ادیب اپنے اپنے طور وضع کرتے رہے ہیں۔ کسی فن پارے کی تخلیق میں دو چیز اہم ہوتی ہیں اول یہ کہ اس میں کیا بیان کیا گیا ہے؟ اور دوم یہ کہ کیسے بیان کیا گیا ہے؟ محسن بھوپالی کے اس بیان کا پہلا حصہ کیا بیان کیا گیا ہے؟ سے تعلق رکھتا ہے ان کے نزدیک ذہنی ارتقا، سماجی شعور اور نظریۂ فن کا اظہار ہی حقیقت کا اظہار ہے۔ جب کہ اس بیان کے دوسرے حصے میں وہ اس بات پر غور وفکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیسے بیان کیا جائے؟ اس سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ کسی سہارے یا ترجمان کے بغیر بیان کیا جائے تو بات زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے اور اس سے اعتدال پسند ذہن زیادہ آسانی سے کسی نتیجے پر پہنچ پاتے ہیں۔ یہاں غالباً محسن بھوپالی کی اس سے مراد بنا کسی استعارے یا علامت اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس کے بغیر اعتدال پسند ذہن زیادہ آسانی سے پہنچ جائیں گے۔ لیکن شاعری کے حسن کا کیا ہوگا؟ اس بات پر انھوں نے زیادہ زور نہیں دیا ہے۔ محسن بھوپالی نے اسی پیش لفظ میں آگے شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا جو اظہار کیا تھا وہ بہت اہم ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

> ''مجھے اعتراف ہے کہ میں انفرادی جذبات اور داخلی احساسات کے بجائے خارجی حقیقتوں اور ان کی ہیئتی تبدیلیوں سے زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ اسی لیے میری بیشتر تخلیقات اجتماعی زندگی اور اس کے گوناگوں متحرک عوامل کا مظہر ہیں۔ ماحول کے دل آویز ورنگین پردوں میں چھپی ہوئی تلخ حقیقتوں کا اظہار میرا مسلک رہا ہے اور پستی کی وادیوں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو سہارا دینا میرا نظریۂ فن۔ تاکہ جدید معاشرہ ''کیا ہے'' اور ''کیا ہونا چاہیے'' کے بارے میں سوچ سکے، سمجھ سکے اور عمل کر سکے اور آج کے سائنسی دور کا یہی تقاضا ہے۔''[۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اس میں محسن بھوپالی نے اپنے نظریۂ فن کا اظہار

کیا ہے۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ذاتی جذبات اور داخلی احساسات کے زیادہ قائل نہیں بلکہ خارجی اور اجتماعی مسائل سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں ساتھ ہی ہیئتی تبدیلیوں سے بھی وہ کافی متاثر ہیں۔ ''پستی کی وادیوں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو سہارا دینا میرا نظریۂ فن'' سے ظاہر ہے کہ وہ ادب کے ذریعے سماج اور انسانیت کو سہارا دینے میں یقین رکھتے ہیں۔ اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نظریۂ فن بہت واضح ہے اس میں کوئی بھٹکاؤ نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس پیش لفظ کو پڑھ کر اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے پہلے مجموعے کے وقت ادب کے بارے میں جو نظریہ بنالیا تھا تقریباً تمام زندگی وہ اسی پر قائم رہے ان کے یہاں حالات کے ساتھ ساتھ کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ وہ اپنے اصولوں پر تاحیات قائم رہے۔ پہلے مجموعے کے وقت ان کے یہاں اگرچہ ہیئتی تبدیلیاں کچھ خاص نہیں ہیں جو بعد میں ان کے یہاں بہت اہم ہیں اور انھیں سے ان کی شناخت بنتی ہے لیکن ہیئتی تبدیلیوں کا اعتراف وہ پہلے مجموعے سے ہی کرتے ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعہ 'جستہ جستہ' اور تیسرا مجموعہ ''نظمانے'' تھا۔ دوسرا خالص قطعات اور تیسرا خالص نظمانوں پر مبنی تھا۔ ان میں انھوں نے کوئی پیش لفظ یا شاعری کے بارے میں اپنے نظریات نہیں پیش کیے ہیں۔ بلکہ ان کے قطعات کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی رائے ضرور شامل ہے۔ اور نظمانوں میں سحر انصاری کا تعارف ہے۔ اس کے بعد ان کا مجموعہ گرد مسافت آیا تو اس میں دیباچے کی شکل میں بہت مختصر سی ''ایک بات'' ہے ضرور لیکن اس میں بھی ایک طرح سے پہلے مجموعے کی باتوں کو ہی دہرایا گیا ہے۔ اور فن کے بارے میں وہ انھیں نظریوں کے قائل نظر آتے ہیں جو پہلے مجموعے کے وقت تھے۔

محسن بھوپالی کا شاید سب سے اہم مضمون ''ہائکو کے بارے میں'' ہے۔ یہ مضمون انھوں نے سب سے پہلے ''ہائیکو کی ہیئت کا مسئلہ'' عنوان کے تحت لکھا تھا جو ''تجدید نو''، لاہور کے جنوری ۱۹۹۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ پھر ترمیم و اضافہ کے بعد ہائیکو پر مبنی ان کے شعری مجموعے ''منظر پتلی میں'' کے دیباچہ کے طور پر شائع

ہوا۔اس مضمون میں جاپانی شاعری خاص طور سے جاپان میں ہائیکو نگاری کی روایت، جاپانی شاعری میں عروض کا تصور اور جاپانی عروض کا اردو کے صوتی نظام اور مزاج کے مطابق اردو ہائیکو کے اوزان کا تعین محسن بھوپالی کا بہت اہم کارنامہ ہے۔اس مضمون میں تحقیقی و تنقیدی دونوں صفات موجود ہیں۔ یہ ایک ایسا مضمون ہے جس نے اردو شاعری میں ہائیکو کی سمت و رفتار کے تعین میں مرکزی کردار ادا کیا۔اس مضمون میں وہ اردو میں ہائیکو کی مقبولیت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''بیشتر اردو شعرا پندرہ بیس برس کے مختصر عرصے میں نہ صرف ہائکو نگاری کی طرف مائل ہوئے ہیں بلکہ ان کی تعداد میں قابل قدر اضافہ ہوتا جارہاہے۔ ملک کے تقریباً سبھی اہم ادبی رسائل کے حصہ نظم میں ہائیکو بھی جگہ پارہاہے۔اور صرف ہائیکو پر مشتمل متعدد شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ کراچی میں جاپان کا قونصل خانہ گزشتہ بارہ برس سے ہر سال اردو ہائیکو مشاعرہ منعقد کرارہاہے جس میں اردو کے اہم سینئر شعرا کے ساتھ ساتھ نئے کہنے والے بھی شرکت کرتے رہتے ہیں۔ان مشاعروں میں پڑھے گئے ہائیکو پر مشتمل اب تک تین مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اور یہ سلسلہ ایک اہم شعری روایت کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔''[۳]

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ محسن بھوپالی اردو میں ہائیکو کے جواز پر گفتگو کر رہے ہیں ان کے استدلال مناسب ہیں۔ اس میں انھوں نے اردو میں ترائیلے اور سانیٹ کے بارے میں بھی گفتگو کی ہے اور اس کے اردو میں پندرہ بیس برسوں میں دم توڑنے کی بات کی ہے جو ایک حقیقت ہے۔

اس مضمون میں ایک اہم صفت جاپانی شاعری میں ہائیکو کے مزاج اور اس کی ہیئت کا تعین ہے۔ جسے انھوں نے تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے بہت ہی مستند اور

معتدل حوالوں کے ذریعے انجام دیا ہے۔ جاپانی ہائیکو کے بارے میں وہ کودنشا انسائیکلو پیڈیا آف جاپان کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''ہائیکو سترہ رکنی صنف سخن ہے جو ۵۔ ۷۔ ۵ کے تین مصروعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ قدیم جاپانی شاعری کی اہم ترین صنف ہے جو آج کے جدید جاپان میں بھی مقبول ہے ...... بعض بنیادی تصورات مثلاً موضوع کا جناؤ، بندش الفاظ اور باطنی ہم آہنگی پر زور دیا ہے لیکن اس نے اپنی اصلاحات میں ہائیکو کے دو روایتی عناصر یعنی سترہ ارکان کی پانچ سات پانچ کے تین مصرعوں میں تقسیم اور موسم یا اس کی علامت کے ذکر کو جوں کا توں رہنے دیا۔''[۴]

شیکی ۱۹ اویں صدی کا شاعر تھا اس نے ارکان میں کچھ تبدیلی بھی کی تھیں لیکن بعد میں وہ ان تبدیلیوں کا خود معتقد نہ رہا تھا کیونکہ اس سے ہائیکو کا مزاج بگڑ رہا تھا۔ اس کے بعد محسن بھوپالی نے اسی مضمون میں جاپان کے جدید نقاد یاسودا کی کتاب ''جاپانی ہائیکو'' کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

''بالآخر ہائیکو کی سترہ ارکان کی روایتی طوالت کو تبدیل کرنے کی کوششیں رائگاں ثابت ہو چکی ہیں۔ اور اب ہائیکو کی سترہ رکنی نظم کی بنیادی تحریک کو سنجیدگی کے ساتھ چیلنج نہیں کیا جاتا۔''[۵]

اس کے بعد اردو میں ہائیکو کے موضوع اور مزاج کے بارے میں بحث کی گئی ہے اس ضمن میں فرمان فتح پوری، رفیق سندیلوی اور محمد امین کے خیالات کو کو خاص طور سے اہمیت دی گئی ہے۔ فرمان فتح پوری کے مضمون اردو ہائیکو منظر پس منظر (مطبوعہ چیری اور چمبیلی ۱۹۸۷ء) کا حوالہ دیا گیا ہے جس میں فرمان فتح پوری لکھتے ہیں۔

''پہلا اور تیسرا مصرع صرف پانچ پانچ صوتی آہنگوں اور دوسرا مصرع سات آہنگوں سے بنتا ہے۔ اردو میں بحر متقارب سے

اس کے وزن و آہنگ کو اس طور پر ظاہر کر سکتے ہیں۔

فعلن فعلن فع ۵

فعلن فعلن فعلن فع ۷

فعلن فعلن فع ۵

موضوع کے اعتبار سے ہائیکو کا تعلق عموماً مناظر فطرت اور موسموں کی خوشگواری اور رومانی طبیعتوں کی جمال پرستانہ امنگوں پر ہوتا ہے۔''[۶]

ان سب مباحث کے نتیجے میں محسن بھوپالی ہائیکو کے دو اہم عناصر قرار دیتے ہیں۔ اول ہیئت اور دوم موسم یا اس کی علامتوں کا ذکر۔ ہیئت کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

''وزن مع تقطیع ملاحظہ ہو۔

آ۔وا۔رہ۔پت۔تے

فع۔لن۔فع۔لن۔فع = ۵

تم۔نف۔رت۔سے۔مت۔دے۔کھو

فع۔لن۔فع۔لن۔فع۔لن۔فع = ۷

کل۔یہ۔کوں۔پل۔تھے

فع۔لن۔فع۔لن۔فع = ۵

(تقطیع کرتے ہوء ھ یا نون غنہ شمار نہیں کیا جاتا لیکن مصرعوں کے ابلاغ کے لیے لکھ دیا گیا ہے) ...... ہائیکو کے مواد میں موسم کی علامت کے ذکر، یا کم از کم ایک ایسے لفظ کا ہونا ضروری ہے جو کسی موسم کی علامت یا اشارے کے طور پر آیا ہو یا اس سے کسی موسم کی نشاندہی ہو سکتی ہو۔ مثلاً لمبا دن، لمبی رات، برفانی ہوا، سرما کا چاند، خشک پتے، تیز دھوپ، بادل، کھلتے پھول، کونپل، شگوفے یا

مختلف موسموں میں پائے جانے والے حشرات الارض یا موسم
کے لحاظ سے استعمال ہونے والی چیزوں یا ملبوسات کا نام
وغیرہ۔''ے

اردو میں اب ہائیکو کی ہیئت کا تعین ہو چکا ہے اور یہ وہی ہیئت ہے جس کی حمایت محسن بھوپالی نے کی تھی۔ ہیئت کے ساتھ محسن بھوپالی نے ہائیکو کے موضوع، مواد اور مزاج کے تعین میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان اقتباسات کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ محسن بھوپالی نہ صرف اردو میں ہائیکو کے بڑے شاعر ہیں بلکہ انھوں نے ہائیکو صنف ہیئت اور اس کے مزاج کے تعین میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ محسن بھوپالی کی شاعری کی دیگر اصناف میں بیشتر خارجی اور اجتماعی مسائل ہیں۔ لیکن محسن بھوپالی کے ہائیکو میں موسم اور اس کے تلازمات اور داخلی کیفیات کا بہت خوبصورتی کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ محسن بھوپالی ہائیکو کے بڑے رمز شناس ہیں اور اپنے مضمون کے ذریعے انھوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

'ہائیکو کے بارے میں' کے علاوہ محسن بھوپالی کے وہ مضامین بھی بہت اہم ہیں جن میں انھوں نے اپنے ہم عصر شعرا کے بارے میں لکھا ہے۔ ان میں گلنار آفرین پر ''تیشۂ غم'' ادا جعفری پر ''ادا جعفری: اردو کی عہد آفریں شاعرہ''، حبیب جالب پر ''حبیب جالب: دیوانہ یاد آتا ہے''، خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مضامین خالص تنقیدی یا تحقیقی نہیں ہیں بلکہ ان مضامین میں ان شعرا کی شخصیت اور ان سے دوستی کے سلسلے کا بھی کہیں کہیں ذکر ملتا ہے۔ خاص طور سے حبیب جالب کے بارے میں جو مضمون ہے۔ یہ مضامین ایک خاص تہذیبی روایت اور ترقی پسندی اصولوں سے وابستگی کے بارے میں بھی ہیں۔

گلنار آفرین اور محسن بھوپالی کا ایک مشترکہ مجموعہ شہر آشوب کراچی شائع ہوا تھا۔ وہ ان کی دوست ہی نہیں بلکہ ہم فکر بھی تھیں۔ گلنار آفرین کا جب دوسرا شعری مجموعہ ''تیشۂ غم'' شائع ہوا تو محسن بھوپالی نے اس مجموعے پر مضمون لکھا تھا جس میں

بہت دیانت داری اعتدال پسندی سے کام لیا گیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ان نظموں میں گلنار نے مصلحت کے بجائے حق گوئی سے کام لیا ہے اور جو کچھ محسوس کیا ہے اسے نہایت بے باکی اور سچائی کے ساتھ نظموں میں بیان کیا ہے اسی لیے یہ نظمیں نہ صرف ان کی بلکہ لاکھوں دلوں کی آواز اور جبر و استحصال کی چکی میں پستے ہوئے لوگوں کی ترجمان بن گئی ہیں۔''۸؎

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ یہاں محسن بھوپالی گلنار آفرین کی جرآت اظہار کی داد دے رہے ہیں، ترقی پسند فکر و خیال سے وابستگی اور جبر و استحصال کے مارے ہوئے عوام کی حمایت کی بات کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ محسن بھوپالی نے شاعری کی دوسری خوبیوں کی طرف توجہ نہیں دی ہے لیکن ان کی انھیں خوبیوں کی زیادہ تعریف کی ہے جن خوبیوں کے وہ خود حمایت کرتے ہیں۔

ادا جعفری کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ایک معروف شاعرہ ہیں۔ شادی سے قبل وہ ادا بدایونی کے نام سے لکھتی تھیں، جعفری صاحب سے شادی کے بعد وہ ادا جعفری بن گئیں۔ وہ اردو کی پہلی شاعرہ ہیں جنھوں نے اردو شاعری میں اپنا ایک الگ مقام بنایا ہے۔ انھوں نے شاعری کا آغاز ۳۶-۱۹۳۵ء کے آس پاس کیا تھا اور پہلا مجموعہ بھی ۱۹۴۷ء میں ترتیب دے لیا تھا لیکن ہنگامی حالات کی وجہ سے ۱۹۵۰ء میں پہلی بار شائع ہوسکا۔ ان سے پہلے کی جتنی بھی خواتین شعرا ہیں ان کا نام اور کلام اس طرح معتبر نہ تھا جیسا کہ ادا جعفری کا ہے۔ ادا جعفری کے بارے میں محسن بھوپالی اس طرح لکھتے ہیں۔

''ادا جعفری جو شادی سے پہلے ادا بدایونی کے نام سے لکھتی تھیں وہ پہلی شاعرہ ہیں جنھوں نے اردو ادب کی تاریخ میں طبقۂ نسواں کی شاعری کو اعتبار بخشا۔ بہ ظاہر یہ بیان مبالغہ آمیز لگتا ہے لیکن اردو شاعری کی روایت اور تاریخ ادب پر نظر رکھنے والے جانتے اور

مانتے ہیں کہ ہماری صدی کی چوتھی دہائی سے پہلے اردو شاعری
میں شاعرات کے نام خال خال ہی نظر آتے ہیں اور چند ایک کو
چھوڑ کر کسی شاعرہ کا کلام یکجا صورت میں دستیاب نہیں ہے۔"۹

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ محسن بھوپالی نہ صرف یہ کہ صاف گو تنقید نگار ہیں، اچھی شاعری کی انھیں فہم بھی ہے بلکہ اردو شاعری اور ادب کی تاریخ پر بھی ان کی نظر ہے تبھی وہ ایسے دعوے کر سکتے ہیں۔ ادا جعفری کے بارے میں بے شک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے خواتین شعرا کو اعتبار و وقار بخشا ہے۔ ادا جعفری کا ہی اثر تھا کہ ان کے بعد اردو میں خواتین شعرا کی ایک پوری کہکشاں وجود میں آ گئی۔ جس میں کشور ناہید، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض اور سارہ شگفتہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

حبیب جالب کے بارے میں محسن بھوپالی کا مضمون "حبیب جالب: دیوانہ یاد آتا ہے" ان کے انتقال کے بعد لکھا گیا تھا جو ایک طرح سے ان کو خراج عقیدت کے طور پر لکھا گیا تھا اس مضمون میں جہاں ایک طرف ان کی شاعری کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں وہیں ان کی شخصیت اور ان سے دوستی کا بھی ذکر ہے۔ حبیب جالب کی ترقی پسند تحریک اور مزدوروں کی تحریک سے وابستگی ایک مثالی وابستگی تھی۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی انھیں تحریکوں کو وقف کر دی تھی۔ وہ نفع نقصان کی پرواہ کیے بغیر تا حیات فوجی آمریت کے خلاف اور جمہوری حقوق کے لیے لڑتے رہے۔ ان کی شخصیت بڑی ہی پر کشش تھی۔ حبیب جالب عوام کے شاعر تھے اور انھوں نے اپنی زندگی انھیں کے نام وقف کر دی تھی۔ محسن بھوپالی ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"وہ سیاسی دھڑے بندیوں کے ہتھکنڈوں اور جمہوریت کے نام
پر عوام کا استحصال کرنے والے حکمرانوں کے جبر کے خلاف شعری
محاذ پر تن تنہا ڈٹ گیا جالب کے بعض سینئر اور ہم عصر شعراء جب
غزل میں اشاروں کنایوں اور نظم کی شعری خصوصیات کو مد نظر
رکھتے ہوئے تخلیقی منصب اور نظریاتی اظہار کے فرض سے عہدہ برآ

ہو رہے تھے ایسے عالم میں اس کی واحد آواز تھی جس نے میدانوں سے بلند ہو کر ایوانوں کو ہدف بنایا تھا۔ فوجی آمریت کی لائی ہوئی پابند جمہوریت کے خلاف یہ نظم کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن گئی۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا۔'' ۱۰

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ حبیب جالب کے بارے میں اس مضمون سے جہاں ان کی شاعری کا رنگ بھی معلوم ہوتا ہے وہیں ان کی شخصیت کی بے باکی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں فکر کے تئیں ان کی وابستگی اور قربانیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے محسن بھوپالی بنیادی طور پر شاعر تھے ان کی تنقید کا بیشتر حصہ، دوست احباب پر ہی مبنی ہے۔ ان کی تنقید بنیادی طور دوستوں کی یاد میں ہے یا اپنی شاعری کا جواز بتانے کا نام ہیں۔ اگر چہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور وہ چاہتے تو با قاعدہ تنقید نگار بن سکتے تھے لیکن اس طرف انھوں نے بہت سنجیدگی سے توجہ کبھی نہ دی۔ لیکن وہ وقت بہ وقت اور حسب حال تنقید لکھتے ضرور رہے، لیکن تنقید کو انھوں نے اپنے مرکزی یا بنیادی حوالوں میں کبھی نہیں شامل کیا۔ پھر بھی ان کی تنقید ایسی نہیں ہے کہ اس کو بالکل ہی نظر انداز کیا جا سکے۔ انھوں نے با قاعدہ تنقیدی مضامین ایک مجموعہ شائع کرایا جس سے ظاہر ہے کہ وہ خود بھی ان تحریروں کو ضروری اور اہم سمجھتے تھے۔

(۲) سفر نامہ

محسن بھوپالی نے ملک اور بیرون ملک کے کئی سفر کیے لیکن ان کا با قاعدہ سفر نامہ ایک ہی ہے، باقی اسفار کا کہیں کہیں ضمنی طور پر ذکر آ گیا ہے جیسے کسی انٹرویو یا

مضمون میں لیکن انھیں سفر نامہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ واحد سفر نامہ ۱۹۹۲ء میں ''حیرتوں کی سرزمین'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ سفر نامہ ان کی امریکہ اور کینیڈا کے اسفار پر مبنی ہے یہ سفر انھوں نے ۱۹۹۰ء میں کیا تھا اور بنیادی طور پر مشاعروں اور کچھ سمیناروں و مذاکروں کے لیے کیا تھا۔ ان کے اس پورے سفر میں مشہور شاعری حمایت علی شاعر اور جون ایلیا بھی ان کے ہم راہ تھے۔ ''حیرتوں کی سرزمین'' کے حرف آغاز میں محسن بھوپالی لکھتے ہیں۔

> '' 'حیرتوں کی سرزمین' کتابی شکل میں آنے سے پہلے برادرم علی سفیان آفاقی کی خصوصی توجہ کے ساتھ ''یہ ہے امریکہ'' کے عنوان سے ہفتہ روزہ فیملی میگزین لاہور میں قسط وار طبع ہو چکا ہے۔
> یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۰ء سے ۲۵ دسمبر ۱۹۹۰ء کے دوران کیے جانے والے اس سفر کا سفر نامہ بھی مذکورہ جریدے میں اکتوبر ۱۹۹۱ء سے دسمبر ۱۹۹۱ء کے دوران ۱۴ قسطوں میں شائع ہوا۔''۱۱

یہ سفر نامہ محسن بھوپالی کی نثری تحریروں میں واحد صنف سخن ہے جسے تخلیقی اظہار کے ضمن میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ سفر نامہ تخلیقی نثر ہے یا علمی؟ یہ بات موضوع بحث ہو سکتی ہے۔ اور کئی بار اس کے مطالعہ کے بعد ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ کئی بار مطالعہ کے بعد بھی فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اسے تخلیقی نثر مانا جائے یا علمی یا صحافتی؟ کچھ سفر نامہ نگار اپنی تخلیقی انداز بیان سے اسے تخلیقی بنا دیتے ہیں جب کہ کچھ لوگ اس میں علمی اور صحافتی خوبیاں کامیابی کے ساتھ لے آتے ہیں۔

محسن بھوپالی نے امریکہ اور کینیڈا کا سفر مشاعروں اور علمی مذاکروں میں شرکت کرنے کے لیے کیا تھا اور تقریباً دو ماہ تک ان دونوں ملکوں میں رہے اور کئی مشاعروں و سمیناروں میں شرکت کی۔ اس سلسلے میں اس کتاب کا انتساب بہت دلچسپ ہے۔ جو اس طرح سے ہے۔

''اردو شاعری کے نام، جس کی بدولت پورے دو ماہ تک براعظم
امریکہ اور کینیڈا کے ایک درجن اہم شہروں کو دیکھنے اور سیر و
سیاحت کرنے کا موقع ملا۔'' ۱۲

یہ ایک عجیب صورت حال ہے کہ کوئی شاعر تقریباً دو ماہ تک امریکہ اور کینیڈا
میں مختلف مشاعروں میں شرکت کرتا اور سیر و سیاحت کرتا رہے ایسا اعزاز بہت کم
زبانوں کے اس سے بھی کم شاعروں کو حاصل ہوتا ہے۔ اس سے اردو شاعری کے
مقبولیت اور شاعری کے زبانی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس شاعری کو لوگ پڑھنے
سے زیادہ سننے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور وہ بھی بہ زبان شاعر۔

اس سفرنامے کی نوعیت کے سلسلے میں محسن بھوپالی نے اس کتاب کے شروع
میں 'اپنی بات' میں لکھا ہے۔

'''حیرتوں کی سرزمین' کو آپ سفرناموں سے ہٹ کر پائیں گے۔
اس میں آپ کو نہ تاریخی اور جغرافیائی معلومات ملے گی۔ نہ تجارت
و معاشیات کے اعداد و شمار کا گورکھ دھندا اور نہ ہی دورانِ سفر کسی
نیلی آنکھوں والی دوشیزہ سے مکالمے اور بعد میں معاشقے کی
داستان نظر آئے گی۔

یہ تو کینیڈا اور امریکہ میں شہروں شہروں منعقد ہونے والے
سیمیناروں اور مشاعروں میں شرکت کی روداد وطن سے دور اجنبی
دیار میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کرنے والوں کے ذکر اور
سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات پر مشتمل ہے۔'' ۱۳

اس سفرنامے کے مطالعے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ محسن بھوپالی نے جو
بات ''اپنی بات' میں کہی ہے، بہت حد تک وہی حقیقت ہے۔ لیکن بات محض اتنی بھی
نہیں ہے اس سفرنامے میں کئی اور چیزیں بھی ہیں۔ محسن بھوپالی خود پیشہ سے ایک
انجینئر تھے، وہ اس سفرنامے میں امریکہ کی سائنس اور تکنیک میں غیر معمولی ترقی سے

بہت متاثر ہیں، انھوں نے اس مجموعے کا نام بھی اسی نسبت سے رکھا ہے۔ ظاہر ہے امریکہ میں تاریخی اعتبار سے تو عجائبات ہیں نہیں۔ جس کا محسن بھوپالی اس سفرنامے میں ذکر کرتے۔ امریکہ اور کینیڈا کی تقریباً تمام تر کامیابیاں اور کامرانیاں اس کی سائنسی اور معاشی ترقی سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھوں نے اس سفرنامے میں جگہ جگہ امریکہ کی حیرت کن سائنسی ترقی کا ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر ''ایل۔ اے۔ کے روز وشب'' باب میں وہ لکھتے ہیں۔

> ''میں نے ریکارڈ کمپیوٹر میں اپنے تمام نغمے ریکارڈ کر دیے ہیں۔ کمپیوٹر کے ذریعے جتنی بھی دھنیں تیار کرتا ہوں وہ بھی ریکارڈ کمپیوٹر میں محفوظ کرتا جا رہا ہوں۔ نغموں کے ریکارڈ کے سلسلے میں ہم نے سوال کیا اگر اس وقت کسی نغمے کی فرمائش کی جائے تو۔ عالم گیر نے کہا پندرہ بیس سکنڈ میں نغمہ ریکارڈ کمپیوٹر کو آپریٹ کرنے کے بعد آپ کو سنوا سکتا ہوں۔ ہم نے کہا مثلاً ''خوشبو کا جھونکا ترے سنگ کر دیا ہے'' والا نغمہ سنوا سکتے ہو؟ سوال سنتے ہی عالم گیر نے کہا لیجیے اور دو تین بٹن دبانے اور ناب کو اوپر نیچے کرنے کے بعد اسپیکر کے ذریعے وہ نغمہ کمرے میں گونجنے لگا۔ ایک صاحب نے کسی اور نغمے کی فرمائش کی اسے بجانے میں بھی دس پندرہ سکنڈ ہی لگے۔''[۱۴]

اس زمانے یعنی ۱۹۹۰ء میں کمپیوٹر کی یہ تکنیکی کامیابی کسی حیرت سے کم نہ تھی لیکن آج کمپیوٹر کی یہ تکنیک بلکہ اس سے بھی ترقی یافتہ شکل ہندو پاک میں بھی عام باتیں ہو چکی ہیں۔ نئی نئی تکنیکوں کو سمجھنا، اس کی داد دینا اور اس کو استعمال کرنا سیکھنا انسان کا ایک فطری عمل ہیں۔ محسن بھوپالی نے اس سفرنامے میں ایسی باتوں کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ صحیح ہے کہ یہ سفرنامہ بنیادی طور پر ادبی وتہذیبی سرگرمیوں پر ہی مبنی ہے۔

اس سفرنامے کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ حقیقی معنی میں ایک سفرنامہ ہے اس سفرنامے میں سفر کا ذکر بہت زیادہ ہے ورگرنہ اکثر سفرناموں میں دیکھا گیا ہے کہ شروع میں کسی سفر کا ذکر کیا اس کے بعد منزل مقصود پر پہنچ گئے اور پھر وہاں کے روز وشب، وہاں کی تہذیب، تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ کا ذکر شروع ہو جاتا ہے یا رپورٹ تیار ہو جاتی ہے لیکن اس سفرنامے میں مختلف قسم کے اسفار کا تفصیلی ذکر ہے۔ چاہے وہ سفر ہوائی جہاز سے کیا گیا ہو، چاہے کار سے، یا پیدل ہی کیوں نہ کیا گیا ہو۔ سفر پر بہت توجہ دی گئی ہے۔

اردو میں عام طور پر کامیاب سفرنامے طنز و مزاح نگاروں نے لکھے ہیں۔ ابن انشا، مجتبیٰ حسین وغیرہ کے نام سفرناموں میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ محسن بھوپالی کی شاعری میں طنز ان کی ایک نمایاں صفت ہے۔ وہ طنز عام طور پر سیاسی یا کبھی کبھی سماجی صورت حال سے پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کے یہاں ایک قسم کی سنجیدگی طنز میں بھی موجود رہتی ہے۔ شروع کی شاعری میں مزاح تھا لیکن بعد میں بہت خال خال ہی کہیں طنز نظر آتا ہے۔ محسن بھوپالی کے سفرناموں کی زبان عام طور پر سنجیدہ، علمی یا صحافتی نوعیت کی ہے لیکن جہاں کہیں بھی موقع ملتا ہے وہ چٹکی لینے سے نہیں چوکتے، خاص طور سے تین شاعروں حمایت علی شاعر، جون ایلیا اور محسن بھوپالی کی آپسی نوک جھونک بڑی دلچسپ ہے، جگہ جگہ پر مزاحیہ مصرعے یا شعر بھی کہے گئے ہیں۔ کامیاب سفرناموں کے لیے زبان میں یا تو معقول مزاح ہونا چاہیے یا ایک قسم کی تخلیقیت ہونی چاہیے۔ محسن بھوپالی کے سفرنامے میں یہ صفات بھی موجود ہیں۔ مزاحیہ صورت حال کی خوبصورت مثال اس اقتباس میں بیان کی گئی ہے۔

> ''گاڑی اب Pacific Coast ہائی وے پر فراٹے بھرتی ہوئی چلی جارہی تھی اور ہر موڑ پر اور ہر آنے والی گاڑی کے قریب تر آنے پر ہمارا پیر خیالی بریک پر جا پڑتا کا کو نے اس لاشعوری حرکت کو بھانپتے ہوئے کہا محسن صاحب بے فکر رہیں ان علاقوں

میں دس سال سے ڈرائیو نگ کر رہا ہوں ......مگر بھائی ہم تو پہلی
دفعہ آئے ہیں اس پر سبھی ہنس پڑے۔'' ۱۵؎

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے مشہور اور معتبر شاعر جون ایلیا اس پورے سفر میں محسن بھوپالی کے ہم راہ تھے ان کی لمبی زلفیں اور دیگر رکھ رکھاؤ کی وجہ سے اکثر لوگوں کو شبہہ ہو جاتا تھا کہ وہ خاتون ہیں۔ ہوائی جہاز سے لاس اینجلس جاتے وقت کچھ ایسا ہی ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر محسن بھوپالی نے ''حیرتوں کی سرزمین'' میں اس طرح کیا ہے۔

''اسٹیورڈ نے متوجہ کرتے ہوئے کھانے کے بارے میں دریافت کیا۔ ہم نے صرف دو لفظ ادا کیے فش پلیز۔ او کے! کہہ کر اس نے بھائی جون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ same of madam (یہی خاتون کے لیے ہے) ہم نے ہنسی روکتے ہوئے یس پلیز کہا۔ بھائی جون نے ایک مرتبہ پھر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا گویا یہاں بھی! ہاں! یہاں بھی یہ خبر پہنچ گئی۔ ہم نے جملہ پورا کر دیا۔ حمایت ذرا فاصلے پر تھے۔ وہیں سے بلند آواز میں بولے! کہ کیا ماجرا ہے؟ ہم نے کہا وہی غلط فہمی اسٹیورڈ انہیں میڈم سمجھ رہا تھا۔ ٹرالی آ چکی تھی۔ اسٹیورڈ نے ٹرے نکال کر سیٹ کاؤنٹر پر بڑے احتیاط سے ہی تھی کہ ہم نے اس کے کان کے قریب ہو کر کہا he is man اس نے فوراً معذرت کرتے ہوئے کہا۔ آئی ایم سوری لیکن دو قدم آگے جا کر اس نے پھر مڑ کر دیکھا جیسے اپنے آپ کو یقین دلا رہا ہو۔'' ۱۶؎

اس سفر نامے کو اس کتاب میں شائع ہونے والی تصویریں بھی ہیں جو مختلف مقامات کی ہیں اور سرِ ورق سے لے کر کئی اندرونی صفحوں میں شائع ہوئی ہیں۔ یہ تصویریں آزادی کا بت، اونچی اونچی عمارتوں، باغات، بحرالکاہل اور قدرتی مناظر

وچند دیگر مقامات کی ہیں۔ کچھ میں محسن بھوپالی بھی نظر آتے ہیں اور کچھ میں صرف عمارتیں یا دیگر تر قیاتی مناظر نظر آتے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب ایک سفرنامے پر مبنی ہے اس لیے ان تصویروں سے سفرنامہ اور بھی مستند جاتا ہے۔

(۳) انٹرویوز

محسن بھوپالی کے انٹرویو دو قسم کے ہیں اول وہ انٹرویو جو خود محسن بھوپالی نے اپنے عہد کے اہم دانشوروں کے لیے تھے اور دوم وہ انٹرویو جو دوسرے حضرات نے محسن بھوپالی سے لیے۔ اول الذکر انٹرویو محسن بھوپالی نے ایک خاص موضوع قومی یکجہتی میں ادب کا کردار پر لیے تھے اور یہ سارے انٹرویو سلسلے وار شائع ہوئے تھے بعد میں یہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے۔ محسن بھوپالی کے لیے ہوئے انٹرویو پر مبنی کتاب ''قومی یکجہتی میں ادب کا کردار'' کے نام سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ محسن بھوپالی کی پہلی نثری کتاب تھی۔ اس کتاب میں جو انٹرویو شامل ہیں یہ انٹرویو اردو ادب میں اپنے زمانے کی بزرگ اور محترم شخصیات سے لیے گئے تھے۔ ان ادیبوں و دانشوروں کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر وزیر آغا، انعام درانی، محشر بدایونی، ہاجرہ مسرور، افتخار جالب، مرزا عابد عباس، عالم تاب تشنہ، سحر انصاری اور جمیل یوسف۔

اس کتاب کے پیش لفظ کے طور پر لکھے گئے ''حرفے چند'' میں محسن بھوپالی لکھتے ہیں۔

> ''یہ ایک قومی المیہ ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے تک جو یکجہتی ہماری قوم کی مثالی صفت کا درجہ رکھتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد یہی صفت آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئی۔'' ۱۷

یہ ایک بڑا متنازعہ بیان ہے حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا وجود ہی ایک فرقہ پرست نظریہ پر مبنی تھا کہ ہندستان اور مسلمان ایک ساتھ نہیں رہ سکتے ہیں اگر چہ یہ صحیح

ہے کہ اس دوران کچھ ایسے سیاسی، سماجی اور لسانی واقعات ضرور ہوئے تھے جس سے کسی بھی دل کھٹا ہوسکتا تھا لیکن چھوٹے چھوٹے واقعات سے اس طرح کھٹا کر لینا اور یہ مان لینا کہ ہندو اور مسلمان مل جل کر نہیں رہ سکتے اس نتیجے پر نہیں پہنچنا چاہیے۔ سچائی یہ ہے کہ مذہب زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے لیکن مذہب زندگی کے لیے سب کچھ نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی بہت سے عوامل سے مل کر بنی ہے تہذیب، تاریخ، جغرافیہ اور مقامیت وغیرہ زندگی کے ضروری حصے مانے جاتے ہیں۔ مذہب ایک ہے تو کیا ہوا؟ ان سب کے مختلف ہونے پر بھی بہت سے تعصب پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اسی پیش لفظ میں محسن بھوپالی نے فیض احمد فیض کے حوالے سے ایک بہت اہم بات لکھی ہے۔

> ''کتنی عجیب بات ہے کہ قومی وسائل ارباب سیاست کے تصرف میں ہوتے ہیں اور مسائل کے حل کے لیے ادیب سے کہا جاتا ہے۔'' ۱۸

کسی ملک کی یکجہتی کا سب سے بنیادی وسیلہ ہوتے ہیں اس ملک کے وسائل پر لوگوں کا اختیار اور وسائل کو پوری ایمانداری کے ساتھ لوگوں میں تقسیم کرنا۔ قومی وسائل سے لوگوں کا بااختیار کرنا یا انھیں محروم رکھنا سیاست کا کام ہے۔ اگر یہ کام ایمانداری سے نہیں کیا گیا تو لوگوں کے ذہنوں میں دوسروں کے تئیں غم و غصہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ تعصب و نفرت کے بیج بھی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ پھر ادب مشکل سے اسے کم کر پائے گا اور ظاہر ہے اس طرح قومی یکجہتی پر اس کا برا اثر پڑے گا۔ اسی طرح کی بات مجنوں گورکھپوری نے بھی ایک سوال کے جواب میں جز و آزادکی وجاہت کرتے ہوئے کہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ۔

> ''انھیں ڈیولپ کرنے کا موقع اور اختیار دینا چاہیے۔ ان کی علاقائی تہذیب ثقافت اور زبانوں کا تحفظ کرنا چاہیے اور سب سے بڑی بات تعصب کو روکنا بلکہ ختم کرنا چاہیے۔ جب تک مختلف اجزاء کو تحفظ حاصل نہ ہوگا وہ قومی یکجہتی میں زیادہ بہتر طور پر اپنا

رول ادا نہیں کر سکیں گے۔''۱۹

اس کتاب میں شامل سبھی گفتگو اہم ہیں لیکن کچھ لوگوں نے نہایت ہی معنی خیز اور گہرائی و گیرائی سے غور و فکر کر کے بات کہی ہیں۔ ایسے لوگوں میں وزیر آغا کا بھی نام شامل ہے۔ قومی یکجہتی کے سلسلے میں ادب کی کارکردگی کے بارے میں ان کے نظریے کے سوال پر وزیر آغا نے کہا تھا۔

''علامہ اقبال نے کہا تھا کہ شاعر معاشرے کی آنکھ ہے اور جس طرح جسم کا ایک عضو بھی مبتلائے درد ہو تو آنکھ چھلک جاتی ہے بالکل اسی طرح قوم کے سارے احساسی اور جذباتی مد و جزر کو شاعر کے کلام میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جب ہمارا ادیب ''آنکھ'' کی اس سطح پر جا پہنچے گا تو ہمارا ادب بھی قومی یکجہتی کے سلسلے میں ایک فعال کردار ادا کرنے لگے گا۔۲۰

ایک ایسے وقت میں جب کہ ہندستان سے بٹ کر بنا پاکستان خود دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور بنگلا دیش نام سے ایک نیا ملک وجود میں آ چکا تھا۔ اس کے بعد بھی پاکستان کے مختلف حصوں میں تشدد جاری تھا۔ اور قومی شیرازہ بکھر رہا تھا خاص طور سے کراچی کے تشدد نے بڑی عجیب و غریب صورت حال اختیار کر لی تھی ایسے میں قومی یکجہتی میں ادب کردار پر غور و فکر کرنا بہت اہم کام تھا۔

محسن بھوپالی کے حوالے سے دوسری نوعیت کے وہ انٹرویوز ہیں جو انھوں نے دوسرے ادیبوں یا صحافیوں کو دیے ہیں۔ اگر محسن بھوپالی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ انٹرویوز زیادہ اہم ہیں کہ ان انٹرویوز میں ہر قسم کے سوالوں پر غور و فکر کیا گیا ہے۔ اور محسن بھوپالی کی شخصیت کو سمجھنے میں بھی یہ انٹرویوز زیادہ اہم ہیں کہ ان میں ہر قسم کے سوالوں کے جواب خود محسن بھوپالی نے اپنی فکر و تجربے کی روشنی میں دیے ہیں۔ ان میں محسن بھوپالی کی ذاتی زندگی کے بارے میں بھی اطلاعات ملتی ہیں اور ان کے فکری و فنی رویہ کے بارے میں بھی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ انٹرویوز کتابی شکل میں نہیں شائع

ہو سکے، جب کہ جو انٹرویو خود محسن بھوپالی نے لیے تھے وہ بہت پہلے کتابی شکل میں شائع ہو گئے تھے۔

محسن بھوپالی سے ان کی حیات میں بہت سے انٹرویو لیے گئے جن میں سے چند اہم انٹرویوز حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مرزا افتخار بیگ، سہ ماہی کہکشاں، کراچی جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ء

۲۔ نسیم نقوی، نوائے وقت ۱۹ نومبر ۱۹۹۲ء

۳۔ سرور ساجد، جنگ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۴ء

۴۔ محمد نسیم اختر، اردو نیوز، جدہ، ۱۴ جون ۱۹۹۵ء

۵۔ گل زیب زیبا ہفت روزہ معیار،

ان انٹرویوز میں محسن بھوپالی سے مختلف قسم کے سوال پوچھے گئے۔ جن کے جواب محسن بھوپالی نے پوری ایمانداری سے دیے۔ کچھ سوال بنیادی قسم کے ہیں مثلاً ان کی پیدائش کہاں اور کب ہوئی؟ ان کا خاندانی پس منظر کیسا تھا؟ وہ قیام پاکستان کے بعد ہندستان سے پاکستان کیسے آئے؟ ان کو اس ہجرت میں کیا کیا صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوال بہت عام قسم کے ہیں ان سے کسی طرح بصیرت میں تو اضافہ نہیں ہوتا ہے لیکن جب کوئی شاعر اہم ہو جاتا ہے اور اس کی حیثیت تہذیبی یا تاریخی ہو جاتی ہے تو ان سوالوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہیں کیونکہ ان سوالوں سے شاعر کے بارے میں ایک مستند معلومات بہر حال حاصل ہو جاتی ہے۔ جو مصنف کے بارے میں حقائق جاننے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ چونکہ ان سب کے بارے میں شاعر یا ادیب خود بتا چکا ہوتا ہے اس لیے جب تک وہ کسی دوسرے ذرائع سے غلط نہ ثابت ہو جائیں تب تک ہم انھیں مستند ذریعہ مان سکتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسے سوال کئی بار مختلف انٹرویوز میں دہرائے بھی جاتے ہیں۔ مثلاً نسیم نقوی، نوائے وقت ۱۹ نومبر ۱۹۹۲ء اور مرزا افتخار بیگ نے سہ ماہی کہکشاں، کراچی جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ء دونوں نے حرف بہ حرف ایک ہی سوال پوچھا ہے۔ وہ سوال یہ ہے۔ ''آپ کی ادبی

زندگی کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟'' مزید حیرانی تب ہوئی جب دونوں کے جواب بھی حرف بہ حرف ایک ملے۔ جب کہ دونوں انٹرویو لینے والے شخص الگ الگ ہیں، اور تقریباً بارہ سال کا زمانی فاصلہ ہے۔

ان انٹرویوز میں کچھ سوال بڑے متنازعہ بھی ہیں۔ ان سوالوں کے جواب سے کسی حقائق کے بارے میں تو معلومات نہیں حاصل ہوتی ہے لیکن ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان متنازعہ واقعات یا موضوعات کے بارے میں خود شاعر کی کیا رائے ہے؟ مثلاً مرزا افتخار بیگ نے سہ ماہی کہکشاں کے لیے لیے گئے ایک انٹرویو میں محسن بھوپالی سے پوچھا تھا۔

''افتخار: محسن صاحب ایک زمانے میں اپنے مزاج کے برعکس رائٹرز گلڈ میں کیوں چلے گئے تھے جس کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ سرکاری تنظیم ہے؟

محسن بھوپالی: یہ بھی ایک کہانی ہے۔ رائٹرز گلڈ میں تو شوکت صدیقی اور ابراہیم جلیس جیسے لوگ بھی گئے تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ رائٹرز گلڈ میں شرکت ایک پالیسی کے تحت کی گئی تھی۔ سوبھوگیان چندانی (جو ہمارے سیل کے انچارج تھے) اور پروفیسر جمال نقوی کی ایما پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ رائٹرز گلڈ میں شامل ہوا جائے تا کہ ترقی پسندوں کے خلاف کارروائی کو روکنے میں مدد ملے۔''[۲۱]

محسن بھوپالی کے کئی انٹرویوز کے اس باب سے قبل بھی حوالے دیے جا چکے ہیں واقعتاً ان انٹرویوز سے محسن بھوپالی کی شخصیت اور ان کی شاعری کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ ان کے بارے میں جاننے کے یہ سب سے اہم اور مستند حوالے بھی ہیں۔ جن میں زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ نظر آتے ہیں۔

کچھ انٹرویوز میں محسن بھوپالی کی شاعری کی مختلف ہیئتوں اور خاص طور سے

جو محسن بھوپالی نے ہیئتوں کے تجربے کیے ہیں صرف انھیں پر گفتگو مرکوز کی گئی ہے۔ مثلاً جمال نقوی کو دیے گئے ایک انٹرویو کا عنوان ہی ہے۔ ''محسن بھوپالی اور جاپانی شاعری'' اس انٹرویو میں تمام سوال اردو میں جاپانی شاعری خاص طور سے ہائیکو کے حوالے سے ہی گفتگو ہے۔ ایک سوال جواب ملاحظہ ہو۔

''ج: اردو ہائیکو میں فطرت اور موسم کے علاوہ دیگر مضامین کی بندش کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

م: جاپانی ہائیکو نگاروں نے بہت حد تک موسم، مظاہرِ فطرت اور حشرات الارض کے ذریعے موسم کے تعین کو اپنے ہائیکو کا موضوع بنایا ہے۔ لیکن جاپان کے قدیم اور جدید متعدد ہائیکو نگاروں کے یہاں میں نے ایسی بھی ہائیکو دیکھے ہیں جو اس پابندی سے آزاد ہیں۔ اس لیے میں اردو شعرا کو اس پابندی پر سختی سے عمل کرنے کا مخالف ہوں۔ ہم اپنے ماحول جذبات و احساسات کے متعلق اپنے خیالات کو ہائیکو میں منتقل کرنے میں پورے طور پر آزاد ہیں۔'' ۲۲

محسن بھوپالی نے ان انٹرویوز میں اپنی زندگی کے تمام اہم واقعات کو بیان کیا ہے۔ ان کے خاندانی پس منظر، ان کی پیدائش، ان کی ابتدائی تعلیم، شاعری کا آغاز اور وجۂ آغاز، نئے ملک پاکستان کی حمایت، سلامتی کے ساتھ پاکستان کو ہجرت، زندگی اور خاص طور سے شاعری اور مشاعروں کی شاعری سے بنے دوست و دشمن بننے تمام تفصیلات محسن بھوپالی نے اپنے ان انٹرویوز میں بیان کی ہیں۔

(۴) اخباری مضامین، فکاہیے، خاکے، رپورتاژ، پیش لفظ اور منظر نامے وغیرہ

محسن بھوپالی ان تمام اصناف یا موضوعات پر گاہے گاہے لکھتے رہے، لیکن ان کی زندگی میں ان سب اصناف یا موضوعات کی وہ اہمیت کبھی نہ رہی جو کسی ادب

پارے کی ہوتی ہے اس لیے انھوں نے کبھی ان کو مجموعے کی شکل میں شائع بھی نہیں کرایا۔ یہ سب حالات کی دین تھے کسی دوست کا مجموعہ شائع ہوا تو اس کے لیے پیش لفظ لکھ دیا، یا اس پر تبصرہ کر دیا اور اکثر بات وہیں پر ختم ہو گئی۔ ان کو سنبھال کر رکھنے کی بھی ضرورت انھوں نے محسوس نہ کی۔

محسن بھوپالی نے اخباری مضامین بہت سے لکھے ہیں جب حالات کچھ ایسے ہوئے کہ دل میں بے چینی پیدا ہوئی تو اس کے خلاف مزاحمتی مضمون لکھ دیا۔ وہ ایک ترقی پسند فکر سے وابستہ تھے جب جب ظلم ہوتا تھا تو وہ اس پر ردعمل ضرور ظاہر کرتے تھے۔ اس کی شکل کبھی تخلیقی اور شعری ہوتی تو کبھی براہ راست اور نثری، محسن بھوپالی کا سفرنامہ جو ''حیرتوں کی سرزمین'' کے نام سے بعد میں شائع ہوا پہلے اخباری مضامین ہی تھے۔ جس میں امریکہ و کینیڈا کے سفر کا بہت تفصیل کے ساتھ اور نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

محسن بھوپالی کی کاوشوں میں فکاہیہ مزاج شروع سے تھا، ان کی ابتدائی شاعری میں بھی مزاح کا پہلو ملتا ہے جو بعد میں طنز میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اخباروں کے لیے بھی کچھ فکاہیے لکھے دو چار فکاہیوں سے کوئی مستقل بات نہیں بنتی اور انھوں نے فکاہیہ پر کوئی سنجیدہ کوشش کی بھی نہیں کی۔ اس لیے بات بس آئی گئی ہو گئی ہو گئی انھیں کسی مجموعے میں بھی شامل نہیں کیا گیا۔ جہاں تک محسن بھوپالی کے لکھے خاکوں کا سوال ہے ان کا بھی وہی حال ہوا جو فکاہیوں کا ہوا۔ دراصل مزاحیہ مضامین اور خاکوں کا بہت گہرا تعلق ہے اگر اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہی خاکہ نگار کامیاب ہوتے ہیں جو طنز و مزاح نگاری میں کامیاب ہوتے ہیں ان کے بغیر بات کچھ خاص نہیں بنتی۔ اردو میں پطرس بخاری، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، ابن انشا، شفیق الرحمٰن وغیرہ سے لے کر عہد حاضر میں مجتبیٰ حسین تک طویل روایت رہی ہے لیکن سب کے سب وہی طنز و مزاح نگار ہی خاکہ نگاری میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جہاں تک محسن بھوپالی کے خاکوں کا سوال ہے تو انھوں نے ایسے کچھ

خاص خاکے نہیں لکھے ہیں بس یہ ہے کہ محسن بھوپالی کی شخصیت کا جو تنوع ہے، اس کی جھلک ان خاکوں سے بھی ملتی ہے۔

محسن بھوپالی کے رپورتاژ کی نوعیت بھی ان کے اندر جو صحافتی عناصر تھے اور محفل آرائی کا جو شوق تھا رپورتاژ انھیں کا نتیجہ تھے۔ انھوں نے رپورتاژ کو باقاعدہ ادبی صنف کے طور پر نہیں لکھا ہے بلکہ ان کا مقصد محض اپنے اندر موجود صلاحیت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ ان کے سفرنامے میں ایک رپورتاژ کی خوبیاں بھی موجود ہیں، یا علاج کے لیے جب انھوں نے لندن اور گلاسگو (اسکاٹ لینڈ) کا جو سفر کیا، وہاں کی ادبی نشستوں کی روداد کو جس طرح سے بیان کیا ہے۔ وہ دلچسپ ہیں، معمولی سے معمولی واقعات پر بھی ان کی نظر رہتی ہے اور زور بیان سے وہ ان میں زندگی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان رپورتاژ میں ان کی حس مزاح بھی اپنا کمال دکھارہی ہوتی ہے اور اسی سے ان کی انفرادیت بھی قائم ہوتی ہے۔ رپورتاژ کے لیے ایک ادیب کی حساس نظر ہونی چاہیے اور لفظوں سے کھیلنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔ یہ دونوں چیزیں ان میں بخوبی موجود تھیں لیکن تیسری اور سب سے ضروری چیز کی ان میں کمی تھی۔ اس فن میں کامیابی کے لیے لگاتار ریاضت درکار ہوتی ہے اس کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ رپورتاژ میں بھی کوئی بہت نمایاں کام نہ کر سکے لیکن اس کے پورے امکانات ان میں موجود تھے۔ ریاضت کا جہاں تک سوال ہے وہ خود بھی اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی پوری توجہ شاعری پر ہی صرف کی ہے۔ نثری اصناف بس کبھی کبھی طبیعت مائل ہونے کے نتیجے میں وجود میں آئیں۔

محسن بھوپالی نے بہت سے پیش لفظ لکھے ہیں وہ اپنی کتابوں کے بھی ہیں اور رر دوسروں کی کتابوں کے لیے بھی۔ جہاں تک اپنی کتابوں کے پیش لفظ کا سوال ہے ان کا تفصیلی ذکر جگہ جگہ اس مقالے میں کیا جاتا رہا ہے۔ ان پر تفصیلی گفتگو ان کی شاعری کے مطالعہ کے دوران بہت بار کیا گیا ہے۔ یہ پیش لفظ محسن بھوپالی کے شاعری کو سمجھنے کے لیے بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کی تنقید کے سلسلے میں بھی ان کے تحریر کردہ پیش لفظوں کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔ خاص طور سے ان کے پہلے شعری مجموعہ ''شکستِ شب' اور ''منظر

تلی میں'' کے پیش لفظ ''ہائیکو کے بارے میں'' بہت اہم ہیں۔ جن کا تفصیلی ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ اب انھیں باتوں کا یہاں پھر سے دہرانہ وقت ذائع کرنا ہوگا۔ لیکن 'شکست شب' میں انھوں نے اپنی شاعری کے بارے میں جو باتیں لکھ دی تھیں وہ ان کی پوری زندگی کے شعری سرمائے پر صحیح ثابت ہوئیں۔ اسی طرح ہائیکو کے بارے میں ان کا مضمون جو پیش لفظ کے طور پر لکھا گیا تھا۔ اس صنفِ سخن کے بارے میں سب سے مستند دستاویز ہے۔ جہاں تک دوسروں کے مجموعوں کے پیش لفظ کی بات ہے تو محسن بھوپالی نے عام طور پر انھیں اپنے پاس سنوار کر نہیں رکھا اور نہ ہی اپنی کسی کتاب میں ان کو شامل کیا۔ ان کی حیثیت بنیادی طور حوصلہ افضائی کی تھی انھوں نے اس کے ذریعے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔

منظر نامے بھی انھوں نے کبھی پیشہ کے طور پر نہیں لکھے اور نہ ہی عزت و دولت کمانے کے لیے لکھے۔ بس کسی دوست نے درخواست کی تو اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔ منظر نامے بھی ان کی شناخت کا ذریعہ نہیں ہیں۔ لیکن جب کوئی مستند شاعر و ادیب کسی بھی نوعیت کا لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہے تو اس میں کہیں نہ کہیں اس کی تخلیقیت نظر آ جاتی ہے۔ پھر محسن بھوپالی کا تعلق تھیٹر سے بھی رہا ہے۔ جوانی میں انھوں نے کئی ڈراموں میں اداکاری بھی کی تھی، ان کے ساتھ کام کرنے والے کچھ اداکار بعد میں پاکستانی سنیما کے بہت بڑے اسٹار بھی بن گئے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے اظہار کا مرکز اپنی شاعری کو ہی بنایا البتہ دوستوں کی درخواست کو بالکل مسترد کرنا بھی ان کا مزاج نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے کچھ منظر نامے لکھے تھیٹر سے وابستگی کی وجہ سے وہ منظر نامے کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف بھی تھے۔ اس لیے وہ کامیاب بھی رہے لیکن ان کی طرف توجہ نہیں کی اور بات کچھ آئی گئی سی رہ گئی۔

بابِ چہارم:

حوالہ جات:

۱ محسن بھوپالی، کچھ اپنے بارے میں (پیش لفظ شکستِ شب، ایوان ادب، ناظم آباد،

کراچی، دسمبر ۱۹۸۹، ص ۶

۲۔ محسن بھوپالی، کچھ اپنے بارے میں (پیش لفظ شکستِ شب، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۸۹، ص ۶، ۷

۳۔ محسن بھوپالی، ہائیکو کے بارے میں (پیش لفظ 'منظر پتلی میں' ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، اگست ۱۹۹۵، ص ۹

۴۔ محسن بھوپالی، ہائیکو کے بارے میں (پیش لفظ 'منظر پتلی میں' ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، اگست ۱۹۹۵، ص ۱۰

۵۔ محسن بھوپالی، ہائیکو کے بارے میں (پیش لفظ 'منظر پتلی میں' ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، اگست ۱۹۹۵، ص ۱۱

۶۔ محسن بھوپالی، ہائیکو کے بارے میں (پیش لفظ 'منظر پتلی میں' ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، اگست ۱۹۹۵، ص ۱۴

۷۔ محسن بھوپالی، ہائیکو کے بارے میں (پیش لفظ 'منظر پتلی میں' ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، اگست ۱۹۹۵، ص ۱۳ و ۱۵

۸۔ محسن بھوپالی، ''تیشۂ غم'' ''سپوتنک'' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۰ ص ۶۷

۹۔ محسن بھوپالی، ادا جعفری: اردو کی عہد آفریں شاعرہ، ''سپوتنک'' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۰ ص ۱۲۵

۱۰۔ محسن بھوپالی، ''حبیب جالب: دیوانہ یاد آتا ہے'' ''سپوتنک'' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۰ ص ۱۳۴

۱۱۔ محسن بھوپالی، حرف آغاز، حیرتوں کی سرزمین، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۲، ص ۸

۱۲۔ محسن بھوپالی، انتساب، حیرتوں کی سرزمین، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۲

۱۳۔ محسن بھوپالی، اپنی بات، حیرتوں کی سرزمین، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۲، ص ۹

۱۴۔ محسن بھوپالی، ایل اے کے روز و شب، سپوتنک، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۰، ص ۶۴

۱۵۔ محسن بھوپالی، ایل اے کے روز وشب، سپوتنک، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۰، ص ۵۶
۱۶۔ محسن بھوپالی، ایل اے کے روز وشب، سپوتنک، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۰، ص ۵۵
۱۷۔ محسن بھوپالی، قومی یکجہتی میں ادب کا کردار، حرفے چند، مکتبۂ فکر ونظر، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۵
۱۸۔ محسن بھوپالی، قومی یکجہتی میں ادب کا کردار، حرفے چند، مکتبۂ فکر ونظر، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۵
۱۹۔ محسن بھوپالی، قومی یکجہتی میں ادب کا کردار، حرفے چند، مکتبۂ فکر ونظر، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۵، ص ۴۷
۲۰۔ محسن بھوپالی، قومی یکجہتی میں ادب کا کردار، حرفے چند، مکتبۂ فکر ونظر، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۵، ص ۴۷
۲۱۔ مرزا افتخار بیگ انٹرویو محسن بھوپالی، سہ ماہی کہکشاں، کراچی جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ء ص ۱۲۰
۲۲۔ انٹرویو محسن بھوپالی و جمال نقوی کے درمیان، بحوالہ ہائیکو انٹرنیشنل، Counsul General of Japan in Karachi. فروری ۱۹۹۹ء

محسن بھوپالی کی ادبی خدمات کا مجموعی جائزہ اور اُن کے مقام و مرتبے کا تعیّن

اردو شاعری کا دامن بہت وسیع ہے اور اس کا دامن بیسویں صدی میں ہزاروں ایسے شاعروں سے بھرا ہے جنھوں نے شاعری کے فن میں طبع آزمائی کی ہے۔ سمندر میں کس قطرہ کا کیا مقام ہے یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن چند شعرا نے اس بحرِ بے کراں میں بھی ایک منفرد لہر کی طرح اپنے آپ کو نمایاں کرلیا اور اپنی ایک منفرد شناخت بنائی ہے۔ بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک روشن رہے ناموں میں ایک نام محسن بھوپالی کا بھی ہے۔ خاص طور سے ہیئتی تجربوں کے لیے اور چند اشعار کا ضرب المثل بن جانے کے لیے محسن بھوپالی کا نام اردو شاعری کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

محسن بھوپالی نے اپنی شاعری کا آغاز بھوپال میں ہی کر دیا تھا لیکن باقاعدہ چھپنے کا سلسلہ نئے ملک پاکستان جانے کے بعد ہوا، ابتداء میں انھوں نے بچوں کے لیے نظمیں کہیں، یہ نظمیں بچوں کے لیے آج بھی بہت اہم ہیں۔ کئی نظمیں ایسی ہیں جو بچوں کی تعلیم اور ان میں وطن پرستی پیدا کرنے کے لیے بہت معنی خیز ہیں۔ ان میں بچوں کی امنگیں بھی ہیں اور بچوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے بھرپور موسیقیت اور غنائیت بھی ہے۔ ان میں جو پیغام چھپا ہے وہ بچوں کے لیے ضروری بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ بچوں کی ان نظموں میں بس ایک کمی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں بعض ایسے فارسی آمیز لفظ بھی آ گئے ہیں جنھیں بچوں کو سمجھنے میں مشکل ہو سکتی ہے۔ باقی ہر لحاظ سے یہ نظمیں بچوں کی نظموں کے لحاظ سے بہت اچھی ہیں۔

محسن بھوپالی جیسے جیسے سن بلوغت کی طرف بڑھتے گئے بچوں کی نظموں کے

ساتھ ساتھ سنجیدہ نظمیں کہنے لگے اور ساتھ ہی غزلیں اور قطعے بھی کہنے لگے۔ آہستہ آہستہ بچوں کی نظمیں پس پردہ چلی گئیں۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ محسن بھوپالی بچوں کے لیے نظمیں کہنا جاری رکھتے۔ بدقسمتی سے اردو میں بچوں کی شاعری کو لوگوں نے بچوں کا ہی مشغلہ سمجھ لیا اور اس طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی اسی لیے اردو میں بچوں کے شاعروں کی بہت کمی ہے اور جب بچوں کے لیے کتابیں تیار کی جاتی ہیں تو ان کے لیے اچھی نظموں کی کمی کا احساس بہت شدت سے ہوتا ہے۔ مولوی اسماعیل میرٹھی جیسے اگر سو دو سو شاعر نہ ہوتے لیکن دس بیس شاعروں کی تو ضرورت تھی ہی اگر اس طرح محسن بھوپالی بعد میں توجہ دیتے یقیناً ایک بہت اہم کام ہوتا لیکن بچوں کی نظموں کے لیے وہ جو سرمایہ چھوڑ گئے ہیں وہ بھی بہت اہم ہے۔

محسن بھوپالی کی بچوں کی شاعری میں ایک نمایاں پہلو اس نئے ملک کی تعمیر تھا وہ بچوں سے محنت کرنے، اسکول جانے، جمہوریت کو قائم رکھنے وغیرہ کی تلقین کرتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان بننے کے بعد بہت جلد قائدِ اعظم کا انتقال ہو گیا اور وطن کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی کہ بقول شاعر ''منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے'' اس حادثے کے بعد ان کے دل میں ایک تلخی بھر گئی۔ اگر چہ وہ ایک ترقی پسند شاعر تھے اور مایوسی کو کبھی اپنے پاس نہ آنے دیا۔ لیکن ایک تلخی اور جد و جہد کی کیفیت آ گئی، اور وہ سیاسی موضوعات پر مزاحیہ نظمیں کہنے لگے جو ''جنگ'' میں شائع ہوتی رہیں۔ دھیرے دھیرے ان کے یہاں شاعری میں طنز بھی شامل ہوتا چلا گیا۔ بعد میں یہ سب باتیں ان کی تمام شاعری کے بنیادی عناصر بن گئے۔ اور انھیں سے ان کی شناخت بنی۔

محسن بھوپالی مشاعروں میں بہت پہلے سے شامل ہونے لگے تھے، اور بہت جلد ہی انھیں مشاعروں میں غیر معمولی طور پر مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اس لیے ان کی شاعری کو عوامی مشاعروں نے کسی نہ کسی طور پر متاثر کیا۔ عوامی مشاعروں کی بہت سی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک خامی یہ ہے کہ ان میں زیادہ گہری اور فکری شاعری کبھی

کامیاب نہیں ہوتی، استعاراتی اور علامتی شاعری کے لیے بھی وہاں بہت کم گنجائش رہتی ہے۔اور ایک بار جسے مشاعرے کی کامیابی کا چسکا لگ جائے وہ مشاعروں میں کامیابی کو جلدی نظرانداز نہیں کر پاتا۔ اگر چہ اس وقت مشاعروں کا معیار آج کی طرح نہ ہوتا تھا۔ اس وقت جگر مرادآبادی مشاعروں کے سب سے بڑے شاعر ہوا کرتے تھے اور وہ ہماری ادبی شاعری کا قیمتی اثاثہ ہیں۔تو محسن بھوپالی کی شاعری کو کسی نہ کسی طور پر مشاعروں نے بھی متاثر کیا۔ اگر چہ محسن بھوپالی کی شاعری تمام سنجیدہ اور معیاری رسالوں اور مجموعوں میں بھی شائع ہوتی رہی لیکن وہ مشاعروں سے کبھی الگ نہ ہو سکے۔

محسن بھوپالی نے جب شاعری شروع کی اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی لیکن جب انھوں نے شاعری میں اپنا مقام بنانا شروع کیا تب تک ترقی پسندی کا زوال بھی شروع ہو چکا تھا اور جدیدیت کا آغاز ٹھیک اسی وقت ہو رہا تھا جب محسن بھوپالی کی شاعری کا آغاز ہوا۔ جدیدیت کے شروعاتی شاعروں میں ناصر کاظمی، ابن انشاء، خلیل الرحمٰن اعظمی اور احمد مشتاق وغیرہ کا نام آتا ہے یہ سارے شاعر محسن بھوپالی کے تقریباً ہم عمر تھے ترقی پسندوں میں ان کے ہم عصروں میں احمد فراز، حبیب جالب وغیرہ تھے جن سے ان کے بہت اچھے مراسم رہے۔ لیکن فیض احمد اس وقت نہ صرف پاکستان بلکہ تمام برِ صغیر کے سب سے مقبول شاعر تھے جو اس وقت جیل میں تھے، ان کی شاعری اور شخصیت دونوں لوگوں کے لیے ہیرو کا درجہ رکھتی تھیں۔ محسن بھوپالی جدیدیت کے اپنے ہم عصروں سے متاثر نہ ہو کر فیض احمد فیض سے متاثر ہوئے اور انھیں کو اپنا ہیرو بنایا۔

پاکستان میں دوسرے ترقی پسندوں میں احمد ندیم قاسمی کی شخصیت نے بھی انھیں بہت متاثر کیا تھا، احمد ندیم قاسمی نے محسن بھوپالی کی حوصلہ افضائی بھی بہت کی اس لیے محسن بھوپالی کی شاعری کے رشتے انھیں دونوں سے ملتے ہیں۔ لیکن کچھ معاملوں میں محسن بھوپالی ترقی پسندوں سے منفرد بھی تھے۔ مثلاً ترقی پسندوں کے یہاں قومیت

اور مذہب سے ایک قسم کی بیزاری پائی جاتی ہے لیکن محسن بھوپالی کی شاعری میں یہ دونوں عناصر کسی حد تک پائے جاتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ ترقی پسند تحریک کا حصہ رہتے ہوئے بھی ان سے منفرد بھی تھے۔ لیکن وہ جدیدیت کا حصہ کبھی نہ رہے۔ ساتھ ہی محسن بھوپالی نے اپنا رشتہ کلاسیکی شاعری سے بھی استوار رکھا، اگرچہ فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے یہاں بھی اسلوب کی سطح پر کلاسیکی شاعری سے رشتہ استوار ہے لیکن موضوعاتی سطح پر اور مجموعی اعتبار سے بھی یہ دونوں ترقی پسند تحریک کے اہم ترین رکن تھے۔ اس طرح محسن بھوپالی کی اپنی ایک الگ شناخت قائم ہوئی یہ شناخت ان کی غزلوں اور نظموں کے ذریعے بنی۔

پہلے مجموعے کے بعد جو ۱۹۶۱ میں شائع ہوا تھا محسن بھوپالی نے ایک دوسری سمت اختیار کر لی اگرچہ ان کی پہلی شناخت جاری رہی اب جو ان کی دوسری شناخت بنی وہ شعری ہیئت میں تجربہ پسندی کی تھی۔ سب سے پہلے انھوں نے قطعہ نگاری پر بھر پور توجہ دی اور ۱۹۶۹ء میں جو ان کا دوسرا مجموعہ ''جستہ جستہ'' شائع ہوا تو یہ خالص قطعات پر مبنی تھا اگرچہ قطعہ کا تعلق کلاسیکی شاعری سے بھی تھا لیکن بیسویں صدی میں قطعہ کی ایک منفرد شناخت قائم ہوئی جو محسن بھوپالی سے قبل مستحکم ہو چکی تھی لیکن جب محسن بھوپالی کا قطعات کا مجموعہ شائع ہوا اس وقت قطعہ نگاری کی صنف کی طرف لوگوں کی توجہ نہ تھی اور محسن بھوپالی کے قطعات نے اس صنف میں نئی جان ڈال دی، سیاسی و سماجی موضوعات پر انھوں نے جو قطعات کہے، خاص طور سے ان میں جو طنزیہ عناصر تھے انھوں نے نہ صرف محسن بھوپالی کی ایک الگ الگ شناخت قائم کی بلکہ اردو میں قطعہ نگاری کو وسعت بھی دی۔ اور اس طرح محسن بھوپالی قطعہ نگاری کے ممتاز شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ اور انھوں نے اردو قطعہ نگاری کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے اپنا ممتاز مقام بنالیا۔

قطعہ نگاری کے بعد محسن بھوپالی کا اگلا مجموعہ ''نظمانے'' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا یہ مجموعہ مکمل طور پر ان کی ایجاد کردہ ایک نئی صنف سخن ''نظمانہ'' پر مبنی تھا۔ یہ صنف نظم اور

افسانے کی آمیزش سے بنی تھی۔ اس میں مختصر نظم کی تمام پابندیوں کے ساتھ ساتھ افسانے کی خوبیاں، خاص طور سے واقعہ اور کردار نگاری موجود تھیں۔ ان کے نظمانوں کو پسند کی نظر سے دیکھا گیا اور ناقدین نے اس صنف میں نئے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے والی صنف قرار دیا۔ خاص طور سے عبادت بریلوی اور شمس الرحمٰن فاروقی نے اس صنف میں بڑے امکانات ہونے کی بات کہی۔ عبادت بریلوی کا خیال تھا کہ یہ صنف اردو شاعری میں ایک نئی روایت بھی بن سکتی ہے کیونکہ اس میں جدید زندگی کے اظہار کے بہت سے امکانات ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس صنف میں فکری شاعری کے امکانات ہونے کا اعتراف کیا۔ انھوں نے محسن بھوپالی کے موجودہ نظمانوں میں ان کے طنزیہ لہجے کی بھی بہت تعریف کی۔ اور کہا کہ اس طنز میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی پائی جاتی ہے جو اس شاعری کو قابلِ قدر بناتی ہے۔ لیکن نظمانے کی روایت کو کوئی دوسرا شاعر آگے نہ بڑھا سکا۔ خود محسن بھوپالی نے بھی اس مجموعے کے بعد اس صنف میں کوئی خاص توجہ نہ دی اور اس مجموعے کے بعد صرف چند نظمانے ہی اور کہے۔ اس طرح محسن بھوپالی اس صنف کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ لیکن اردو شاعری کی تاریخ میں ان کا نام اس صنف کے تجربے کے لیے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

نظمانے کے بعد محسن بھوپالی کی نظموں اور غزلوں کا سلسلہ پھر اسی رفتار سے جاری رہا اس کے بعد ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں ان دونوں اصناف میں وہ مشق کرتے رہے اور دوسروں سے مشاقی کا لوہا منواتے رہے۔ اس کے بعد محسن بھوپالی نے ایک اور صنفِ سخن پر توجہ دی وہ صنف تھی جاپان کی مقبول ترین صنفِ سخن ہائیکو۔ اگرچہ اردو میں جاپانی شاعری اور ہائیکو کی مثالیں محسن بھوپالی سے پہلے بھی مل جاتی ہیں۔ لیکن محسن بھوپالی سے قبل کی ہائیکو سے ملتی جلتی جاپانی شاعری کو مکمل طور پر ہائیکو کہنے پر سوال اٹھائے جا سکتے ہیں۔ دراصل ہائیکو کی موجودہ ہیئت آہنگ اور مزاج کے تعین میں محسن بھوپالی کا مرکزی کردار رہا ہے۔ ان سے قبل اردو میں جو ہائیکو شائع ہوئے وہ ہائیکو کی ابتدائی صورتیں تھیں۔ اس طرح اردو میں ہائیکو کا پہلا شاعر اگر محسن بھوپالی کو نہ بھی مانا جائے تو بھی اردو میں ہائیکو کے سب سے اہم شاعر محسن بھوپالی ہی

مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے تخلیقی مزاج کو بروئے کار لاتے ہوئے ہیئت کا تعین کیا اردو ہائیکو کو جاپانی ہائیکو کی طرح وقار عطا کیا۔ اب اردو میں ہائیکو کی ایک روایت قائم ہو چکی ہے اور سیکڑوں شاعر ہائیکو میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ لیکن ان سب میں محسن بھوپالی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ جسے محمد امین سے لے کر سحر انصاری، سہیل احمد صدیقی اور رفیق سندیلوی تک سب نے قبول کیا ہے۔ اردو میں شائع ہونے والا ہائیکو کا سب سے پہلا مجموعہ محمد امین کا تھا انھوں نے خود کہا ہے کہ اردو میں ہائیکو کو وقار اس لیے ملا کہ اسے محسن بھوپالی جیسا شاعر ملا سہیل احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ محسن بھوپالی نے شروع میں سندھی سے جو ترجمے کیے تھے ان کی اہمیت اصل کی سی ہے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو محسن بھوپالی اردو میں ہائیکو کا تعارف کرانے والے شاعر ہیں اور اس کی ہیئت و مزاج بنانے والے شاعر بھی محسن بھوپالی ہی ہیں۔

اس تجزیہ سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ محسن بھوپالی کا نام اردو کی تین اصناف میں یعنی قطعہ نگاری، نظمانے اور ہائیکو کے سب سے بڑے شعرا کے ساتھ لیا جا سکتا ہے، جس میں سے نظمانے کے تو وہ خود ہی موجد ہیں۔ جب کہ غزل اور نظم میں بھی وہ اپنی ایک الگ شناخت بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ کچھ اشعار کا ضرب المثل بن جانے کے وجہ سے بھی ان کا نام اردو کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

محسن بھوپالی کے معاصرین اور ان کی شاعری کے مشترکہ موضوعات:

محسن بھوپالی شروع ہی سیاسی نظمیں کہتے تھے، اس دور میں سیاسی نظمیں کہنے والے تقریباً تمام شعرا کسی نہ کسی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اخبار جنگ کے نمائندہ سرور ساجد کو دیے گئے ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا تھا۔

> ''میں ذہنی طور پر ہمیشہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہا اس لیے سیاست اور معاشرے کو دیکھنے کا ایک ترقی پسندانہ رویہ مجھ میں موجود تھا جس کی بنا پر تلخ حقائق میرے سامنے آئے اور شاعری

میں تلخی اور مزاحمت آ گئی۔

جنگ: مگر اب تو آپ کی شاعری میں بھی اور مزاج میں بھی نرمی آ گئی ہے۔

محسن بھوپالی: جی ہاں شعری مزاج میں نرمی کو فیض کا اثر سمجھیں اور پھر شاید یوں بھی ہے کہ مخدوم کی شاعری میں جو رومانی عنصر تھا، اب یہ عنصر مجھ پر حاوی ہوا ہے مگر ۲۵۔۳۰ فیصد سے زیادہ نہیں۔"[۱]

اس انٹرویو سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں کہ اول تو محسن بھوپالی فکری اعتبار سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں دوم وہ ترقی پسند شعرا میں فیض احمد فیض سے خاص طور سے اور کچھ رومانوی اثر ان کے یہاں مخدوم محی الدین سے بھی آئے ہیں۔ جدیدیت سے متاثر ہونے والے شاعروں اور ادیبوں کو چھوڑ کر، فیض احمد فیض سے وہ پوری نسل متاثر تھی محسن بھوپالی چوں کہ شروع سے ہی سیاسی، سماجی اور تہذیبی شاعری میں دلچسپی رکھتے تھے اس لیے ان کا فیض سے متاثر ہونا بہت فطری بات تھی۔ لیکن فیض سے متاثر ہونے والوں میں بھی الگ الگ طرح کے لوگ تھے کچھ کو ترقی پسند تحریک سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن ان کے یہاں جو کلاسیکی لہجہ اور اسلوب کی نرمی و بالواسطہ شعر ہیں اس کی وجہ سے پسند کرتے تھے کچھ ان کی ترقی پسند نظریہ سے اور کچھ ان کی شخصیت سے بھی متاثر تھے۔

محسن بھوپالی ترقی پسند تحریک کے کچھ رویوں کو چھوڑ کر فیض کے فکری اور فنی دونوں رویوں سے متاثر تھے۔ اس لیے فیض کا اثر ان کے یہاں سب سے زیادہ نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں جمال نقوی لکھتے ہیں۔

"جس نظریے سے ان کی وابستگی رہی ان کی منزل تو فلاحی مملکت کا حصول تھا جس میں سماجی خوش حالی اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی ہر شہری کا پہلا حق تھا۔ صبح آزادی کا نور صرف خواص کا ہی مقدر بنا اور عوام اول روز سے ہی اس سے محروم رہے تو اس داغ داغ

اجالے اور شب گزیدہ سحر کے لیے انھوں نے بھی اپنے ایک قطعہ میں کہا۔

چلے تھے وادیٔ گلپوش کی تمنا میں
ہمارے ذہن میں کانٹوں کا سلسلہ تو نہ تھا
یہ ایک دن کا چراغاں، یہ ایک دن کی بہار
خطا معاف ہمارا یہ مدعا تو نہ تھا

اسی احساس کے تحت انھوں نے اپنے اولین شعری مجموعے کو شکست شب کا نام دیا، لیکن روشن خیالی کی اس شکست کو انھوں نے اپنا مقدر نہیں بنایا بلکہ جرات اور حوصلے سے بھرپور اس قسم کی نظمیں کہیں۔

حیات نو کا تقاضا یہی ہے ہم نہ رکیں
صدائیں آتی رہیں دم بہ دم قدم نہ رکیں
ذرا سی لغزش بیجا ہے علم و فن کا زوال
زباں پہ بندشیں لگ جائیں پر قلم نہ رکیں'' ۲

اس نظم میں فیض کی نظم ''صبح آزادی'' کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ فیض اس وقت اردو کے سب سے مقبول شاعر تھے ان کی شاعری کا اثر ان کے تمام ہم عصروں پر پڑا ہے۔ خاص طور سے ترقی پسند حلقے کے تمام شعرا نے کہیں نہ کہیں ان سے اثر قبول کیا ہے محسن بھوپالی بھی ان میں سے ایک تھے۔ فیض کی وہ نظم اس طرح سے ہے۔

صبح آزادی

اگست ۴۷ء

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر

چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب ست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل

کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

محسن بھوپالی کی نظم کے آخری مصرعے میں فیض کی ایک اور نظم ''لوح و قلم'' کے پہلے شعر کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ دونوں کے یہاں زبان اور اظہار خیال پر پابندی کے خلاف جدوجہد کا عزم کیا گیا ہے۔ فیض کا وہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

پہلے قطعہ کے دوسرے شعر میں ترقی پسند شاعر دشینت کمار کی ایک غزل کی بھی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ دشینت کمار کا شعر حسب ذیل ہے۔

کہاں تو طے تھا چراغاں ہر ایک گھر کے لیے
کہاں چراغ میسر نہیں شہر کے لیے

محسن بھوپالی نے بعض اشعار کلاسیکی شعرا کے موضوعات پر بھی کہے ہیں اور ان میں ایک نیا مضمون پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش کسی حد تک کامیاب بھی کہی جائے گی۔ اردو شاعری کے مزاج میں یہ بات شامل رہی ہے کہ اساتذہ کے مضمون پر اپنا شعر کہا جائے اور کوشش کی جائے کہ اس مضمون میں ایک نیا پہلو یا معنی

پیدا کیے جائیں۔ محسن بھوپالی کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسے مضامین اپنے معاشرے اور حالات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور اس طرح کی ان کی اکثر کوششیں کامیاب بھی ثابت ہوئی ہیں۔

محسن بھوپالی: ناقدین کی نظر میں:

محسن بھوپالی کی خوش قسمتی یہ رہی کہ ان کی شاعری نے اپنے ابتدائی زمانے میں ہی دھوم مچادی تھی اور ان کے شعر ہر خاص وعام کی زبان پر آنے لگے تھے۔ اس لیے ان کی شاعری پر اس زمانے میں ہی جب کہ وہ ابھی محض بائس تیئس برس کے ہی ہوئے تھے۔ لوگوں نے ان پر توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ اس وقت اہم ترین شعرا اور ناقدین نے بھی ان کی شاعری کو غور سے سنا یا پڑھا تھا۔ اور اکثر و بیشتر شعرا نے ان کی شاعری کا تحریری طور پر اظہار بھی کیا۔ جب محسن بھوپالی نے شاعری شروع کی وہ وقت ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا اور محسن کی شاعری میں ترقی پسند عناصر ابتدا سے ہی تھے اس لیے ترقی پسند ناقدین وشعرا نے بھی ان کی طرف توجہ دی۔

محسن بھوپالی کی مقبولیت محض ترقی پسند حلقے تک محدود نہ تھی کیونکہ ان کے یہاں کلاسیکی اردو شاعری خاص طور سے غزل کی شعری روایت کی پاسداری بھی تھی اس لیے ان ناقدین نے بھی محسن بھوپالی کو پسند کیا جن کا ترقی پسند تحریک سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن شاعری کے فن میں ان کی گہری دلچسپی تھی یا جو انسانی صداقت کے متلاشی تھے ان لوگوں نے بھی محسن بھوپالی کی شاعری کو پسند کیا اس سلسلے میں سب سے اہم نام علامہ نیاز فتح پوری کا ہے انھوں نے ''شکستِ شب'' کی اشاعت کے بعد ہی محسن بھوپالی کی شاعری کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ انھوں نے اپنے مشہور زمانہ رسالہ نگار میں ۱۹۶۲ء میں ہی لکھا تھا۔

''محسن بھوپالی نوجوان شاعر ہیں اور وہ اسی دور کے شاعر ہیں۔
جب نظم غزل پر چھا گئی تھی اور ''ادب برائے زندگی'' کی میکانکی

نے شاعری کو بڑی حد تک بے جان کر دیا تھا۔ لیکن اسی دور میں
بعض شعرا ایسے بھی پیدا ہوئے، جنھوں نے غنائی شاعری اور اس
کی تکنیک کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور ان کی فکر کا اسلوب نہ
بدلا۔ انھیں میں سے ایک محسن بھوپالی ہیں۔ جن کے یہاں شعر
محض فن نہیں بلکہ اشارۂ صداقت بھی ہے۔''[۳]

محسن بھوپالی کا پہلا مجموعہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا اس کی اشاعت پر کئی بزرگ ناقدین و شعرا نے محسن بھوپالی کی شاعری پر اظہار خیال کیا تھا۔ ان میں سب سے اہم نام ہے ممتاز ترقی پسند ناقد ممتاز حسین کا انھوں نے اس مجموعے کے فلیپ کے لیے جو لکھا تھا وہ بہت اہم ہے بلکہ آج اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی محسن بھوپالی کی شاعری کو سمجھنے کے لیے یہ بنیادی بات ہے وہ لکھتے ہیں۔

''محسن احساسات کا شاعر ہے۔ اس کا سازِ دل بڑا ہی نازک اور
حساس ہے۔ اس کے کلام میں سوز و گداز اور گھلاوٹ ہے بظاہر یہ جملہ
رسمی معلوم ہوتا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب
اسے ذہن میں رکھا جائے کہ محسن بھوپالی کے یہاں دور حاضر کی وہ پٹی
ہوئی خطابت نہیں ہے جو شعوری شاعری کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے اور
یہ کس قدر اچھی بات ہے کہ جہاں انھوں نے ایک طرف خطابت سے
گریز کیا ہے وہاں انھوں نے دور حاضر کے بے معنی ابہام سے اپنے کو
دور رکھا ہے۔ اس کے کلام میں احساسات و تخیل اور جلائے معنی کا بڑا
خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔''[۴]

ممتاز حسین نے محسن بھوپالی کی شاعری کی بنیادی صفات ان کے پہلے مجموعے کے شائع ہونے کے وقت ہی پہچان لی تھیں یہ بات اور ہے کہ محسن بھوپالی نے بعد میں شاعری میں کئی تجربے کیے خاص طور سے نظمانے اور ہائیکو کے حوالے سے لیکن ان کا بنیادی آہنگ و اسلوب وہی قائم رہا جو شکستِ شب کے وقت تھا یعنی کلام میں سوز و

گداز اور گھلاوٹ آخر تک قائم رہی۔اس ترقی پسند عہد کی خطابت اور ان کے زمانے کی جدیدیت نے جس ابہام کو فروغ دیا محسن بھوپالی نے اپنے لہجے میں دونوں سے گریز کیا اور ایک ایسا راستہ نکالا جو اردو شاعری کی روایت سے ربط رکھتے ہوئے بھی اپنے عہد کی آواز بن کر ابھرا۔شکست شب کی اشاعت کے وقت ہی اس زمانے کے مشہور ترقی پسند شاعر احسان دانش نے اس مجموعے کے بارے میں لکھا تھا۔

"شکستِ شب میں شاعر کی ترقی پسند فطرت اور بلند ارادے ہر صفحہ پر اپنا پتہ دے رہے ہیں۔اگر اسے وقت کی تمازت متشدد عناصر نے مرجھا نہ دیا تو ایسا شاعر ملکوں اور قوموں کی دولت قرار پاتا ہے۔"[۵]

احسان دانش نے جو بات محسن بھوپالی کی شاعری کے بارے میں کہی تھی وہ کسی حد تک صحیح ثابت ہوئی اور محسن بھوپالی قوم کی دولت کے طور پر ابھرے۔ترقی پسند اصولوں سے جو وابستگی انھوں نے ابتدا میں دکھائی تھی وہ بھی تا حیات جاری و ساری رہی اور ان کی شاعری تمام زندگی قوم و ملک کی خدمت اور بے سہاروں کی آواز بن کر ابھری انھوں نے تمام عمر کبھی حالات اور سیاست سے مفاہمت نہیں کی اور اپنے اصولوں پر قائم رہے۔جب کہ پاکستان میں بار بار فوجی حکومتیں بنیں، حقوق انسانی کی پامالی ہوئی لیکن وہ ہمیشہ بے خوف ڈٹے رہے۔بے باکی سے اپنے مافی الضمیر کا شاعری میں اظہار کرنا ان کی ایک بڑی صفت ہے۔یہ بات اس وقت اور بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہے کہ وہ یہ سارا کام ایک سرکاری عہدے پر فائض ہونے کے ساتھ ساتھ کر رہے تھے۔

محسن بھوپالی کا دوسرا شعری مجموعہ جستہ جستہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تو اس مجموعے کا دیباچہ اس عہد کے بڑے ترقی پسند شاعر، افسانہ نگار، ناقد، مدیر اور دانشور احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا، انھوں نے محسن بھوپالی کا کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔یہ مجموعہ خالص قطعات پر مبنی تھی اور احمد ندیم قاسمی نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ محسن

بھوپالی کے قطعات اردو شاعری کے روایت میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے لکھا تھا۔

''محسن بھوپالی ''بزم قطعہ نگاراں'' میں نو وارد ہے۔ مگر اس نے اس بزم میں بڑی خود اعتمادی کے ساتھ قدم رکھا ہے۔ اس نے تھوڑی سے مدت میں جو قطعات لکھے ہیں وہ اس قدر مکمل اور بھر پور ہیں کہ میں سمجھتا ہوں، صرف محسن کی وجہ سے اردو میں قطعہ نگاری کو ایک نئی زندگی ملی ہے۔ پرانے قطعہ نگاروں کی خاموشی سے یہ لطیف اور موثر صنف سخن بظاہر دب چلی تھی لیکن محسن بھوپالی کی قطعات نے اس کی رگوں میں تازہ اور صحت مند خون رواں کر دیا ہے۔''[۶]

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ احمد ندیم قاسمی اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ محسن بھوپالی قطعات میں نو وارد ہونے کے باوجود، انھوں نے اس صنف میں اپنے فن کے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ ان کی وجہ سے قطعہ نگاری کو ایک نئی زندگی ملی ہے۔ ان کے بعض قطعات اتنے بھرپور اور مکمل ہیں کہ خود اس صنف کو ان کی ذات سے ایک نیا وقار ملا ہے۔ وہ اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ پرانے قطعہ نگار شعرا کی اس صنف میں خاموشی کی وجہ سے جو ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا محسن بھوپالی کے قطعات کی وجہ سے اس صنف سخن میں ایک تازہ اور صخت مند خون رواں دواں ہو گیا ہے۔ محسن بھوپالی نے مرزا افتخار بیگ کو دیے گئے انٹرویو میں کہا تھا۔ یہ انٹرویو ''کہکشاں'' جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ میں شائع ہوا تھا۔

''افتخار: آپ کی نظر میں عہد حاضر کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟
پاکستان کی حد تک زندہ شاعروں میں احمد ندیم قاسمی ان کے فوراً بعد احمد فراز کو بڑا شاعر مانتا ہوں۔''[۷]

کسی بھی تخلیق کار کے لیے وہ وقت اس کی زندگی کا بہت اہم وقت ہو جاتا ہے

بلکہ زندگی کا کامیاب ترین دن جب تخلیق کار جسے سب سے بڑا شاعر مانتا ہو وہ شاعری اپنی شاعری کی اس طرح کھل کر تعریف کرے۔ اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی کامیابی کا دن بن جاتا ہے۔ محسن بھوپالی اس کامیابی سے سرفراز ہوئے۔

محسن بھوپالی کا تیسرا مجموعہ نظمانے تھا جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا، یہ مجموعہ دراصل ایک نئی صنف سخن ''نظمانے'' پر مبنی ہے اس مجموعے کی تمام شاعری کا تعلق اسی صنف سخن سے ہے اور اس صنف کے موجد خود محسن بھوپالی ہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت پر ان کا غیر معمولی طور پر استقبال ہوا۔ یہ صنف سخن بنیادی طور پر نظم اور افسانے کی آمیزش سے بنی ہے۔ جو نظم کی طرح مختصر بھی اور زبان کا لہجہ بھی نظم ہے لیکن اس میں افسانے کی خوبیاں بھی موجود ہوتی ہیں، خاص طور سے کردار اور واقعات بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن نظمانوں کی سب سے بڑی خوبی ان کا طنزیہ لہجہ ہے۔ جس سے اس میں ایک ادبی وقار آ گیا ہے۔

محسن بھوپالی کے نظمانوں کا اعتراف کرنے والوں میں جہاں ایک طرف محسن بھوپالی کے بزرگ ناقد اور ادیب ہیں، مثلاً اختر حسین رائے پوری، عبادت بریلوی، قتیل شفائی وغیرہ۔ وہیں ان کے ہم عصر اور بعد کے بھی ناقد و ادیب شامل ہیں خاص طور سے شمس الرحمٰن فاروقی، ابن انشاء، حمایت علی شاعر، فرمان فتح پوری، میرزا ادیب، سلیم اختر، محمد علی صدیقی، آغا امیر حسن، سلطان جمیل نسیم، رئیس امروہوی وغیرہ بہت سے ناقدین و ادیب نے محسن بھوپالی کے نظمانوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بیشتر اوقات نظمانے کے تجربے کو تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔ یہاں ان تمام ناقدین و ادیبوں کے حوالے دینا ممکن نہیں ہے اور اکثر نے وہی باتیں اپنی اپنی زبان اور اپنے اپنے انداز میں کہی ہیں۔ سب سے پہلے اختر حسین رائے پوری کا حوالہ دینا مناسب ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں۔

''انھوں نے نظم کی طویل بیانی سے بچنے کا نیا انداز نکالا اور سوچا کہ
کیا ضروری ہے کہ کہانی مثنوی کی طرح 'منظوم' اس زمانے میں

جب پڑھنے کی فرصت کم کو میسر ہے۔ کیوں نہ ایسی ترکیب کی
جائے کہ چند سطور میں ہی کام کی بات کہہ دی جائے۔ ''نظمانہ''
گویا ''مثنوی زادہ'' ہے۔ روزمرہ کے واقعات کو ایسے اختصار سے
رقم کیا گیا ہے۔ جسے عطر محسن کہا جا سکتا ہے۔
یہ تجربہ انوکھا ہے اور بذات خود نہایت دلچسپ۔ کچھ لوگ اسے بیداد
کہیں گے۔ مگر ہم تو ان کی اپج کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔'' ۸

اختر حسین رائے پوری نے اس اقتباس میں نظمانہ کی بنیادی خوبی اس کا اختصار کو قرار دیا ہے، اور اختصار کو اس زمانے کے لحاظ سے بہت اہم مانا ہے۔ عبادت بریلوی کا نام اردو کے اہم نقادوں میں شمار ہوتا ہے اور ان کا تعلق محسن بھوپالی کی بزرگ نسل سے ہے۔ انھوں نے اپنے تاثر میں ایک تو اس بات کا ذکر کیا ہے کہ یہ صنف روایت کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ کیونکہ اس کا مزاج اردو کی جدید شاعری کے مزاج کے مطابق ہے۔ عبادت بریلوی نے ان نظمانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''محسن بھوپالی نے ایک نئی صنف کی داغ بیل ڈالی ہے، اور اس کا
نام ''نظمانہ'' رکھا ہے۔ یہ ایک تجربہ ہے جو روایت کی صورت بھی
اختیار کر سکتا ہے۔ کیونکہ اردو کی جدید شاعری اس مزاج اور انداز نا
آشنا نہیں ہے، جس پر محسن جس پر محسن نے اس صنف کی بنیاد رکھی
ہے۔
رمز و ایما کی کیفیت، ایجاز و اختصار اور ایک ڈرامائی شان ان
نظمانوں کی وہ خصوصیات ہیں جو اس پر گہرے نقوش ثبت کرتی
ہیں اسی انداز کے ساتھ انسانی زندگی کی بنیادی اور اہم حقیقتوں کی
ترجمانی ان نظمانوں میں بڑے سلیقے سے کی گئی ہے۔'' ۹

عبادت بریلوی نے ان نظمانوں کی جو اہم صفات بتائی ہیں وہ رمز و ایما اور

ایجاز و اختصار ہے ساتھ ہی ان میں جو ایک قسم کی ڈرامائی شان ہے جس کی وجہ یہ نظمانے بہت موثر ہو گئے ہیں۔ ساتھ ہی محسن بھوپالی کی وہ صفات جو ان کی تمام اصناف کی شاعری میں موجود ہیں وہ یہ ہیں کہ ان میں زندگی کی بنیادی اور حقیقتوں کا بے لاگ اور بے باک بیان وہ بھی ایک مخصوص شعری سلیقے کے ساتھ۔

شمس الرحمٰن فاروقی محسن بھوپالی کے ہم عصروں میں ہوتا ہے وہ اردو میں جدیدیت کے سب سے بڑے ناقد مانے جاتے ہیں ساتھ ہی کلاسیکی ادب پر جو انھوں نے کام کیے ہیں ان کی بھی کیفیت جدید کلاسک کی ہوگئی ہے۔ وہ ایک سخت گیر ناقد ہیں اور جلدی کسی کی تخلیقات کا اعتراف نہیں کرتے ہیں لیکن اگر وہ کسی کا اعتراف کرلیں تو عام طور پر وہ ایک مستند تخلیق کار سمجھا جاتا ہے ان کی خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ تجربہ پسندی کو بہت اہمیت دیتے ہیں ان کا ماننا ہے ادب میں تجربے ہوتے رہنے چاہیے انھیں تجربوں میں سے کچھ اچھے اور نئے تجربہ بھی نکل کر آئیں گے جدیدیت کے عروج کے زمانے میں انھوں نے اپنے رسالے ''شب خون'' میں بہت سے تجربوں کو جگہ دی تھی۔ وہ محسن بھوپالی کے نظمانوں کے سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

> ''افسانہ یا واقعہ یا مکالمہ برقرار رکھتے ہوئے مختصر نظم کی تاثیر کو ہاتھ سے نہ جانے دینا بڑے معرکے کا کام ہے۔ محسن بھوپالی ''نظمانے'' میں یہ معرکہ سر کرنے میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ گرد و پیش کے حقائق پر ان کی نگاہ گہری بصیرت کے بجائے فوری اثر کی حامل ہے اور ان کے یہاں تفکر سے زیادہ مشاہدے کا رنگ نظر آتا ہے۔ ورنہ یہ صنف (جس کے وہ موجد کہے جا سکتے ہیں) تفکری طرز اظہار کے لیے بھی بہت مناسب ہے۔ محسن کے نظمانوں میں طنز کا رنگ غالب ہے لیکن ان کے طنز میں تلخی کا تشنج نہیں بلکہ ایک طرح کی سنجیدگی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ محسن بھوپالی اس صنف کے مزید امکانات کو بھی

بروئے کار لائیں گے۔''۱۰

شمس الرحمٰن فاروقی نے نظمانے کے تجربے کو بہت کمال کا مانا ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں افسانہ یا واقعہ یا مکالمہ کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں مختصر نظم کی تاثیر کو بھی قائم رکھنا اپنے آپ میں کمال کی بات ہے۔ اگر چہ ان کا یہ بھی خیال ہے محسن کے یہاں تفکر اور بصیرت کی بجائے مشاہدے اور فوری تاثر کا رنگ زیادہ نظر آتا ہے۔ جب کہ یہ نئی صنف سخن تفکری طرز اظہار کے لیے بہت موزوں ہو سکتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے محسن بھوپالی کے نظمانوں میں جو طنزیہ لہجہ ہے اس کی نشاندہی کی ہے اور اسے محسن بھوپالی کی ایک بڑی قوت کہا ہے۔ یہ بھی کہا کہ اس میں ایک طرح کی سنجیدگی ہے تلخی کا تشنج نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس صنف میں موجود مزید امکانات کو بروۓ کار لانے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ محسن بھوپالی کے یہاں فوری تاثر اور جذباتی اظہار زیادہ ہے اس بات کا اعتراف خود محسن بھوپالی نے اپنے پہلے شعری مجموعے ''شکستِ شب'' میں ہی کیا تھا۔

محسن بھوپالی کے نظمانے پر بہت سے ناقدین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں پر جستہ جستہ سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے لیکن ان میں جن خاص باتوں کا ذکر کیا گیا ہے یہاں ان میں سے خاص خاص کا بحث کی جا سکتی ہے۔ سب سے اہم اور پہلی بات جو تقریباً سب نے کہی وہ یہ ہے کہ یہ ایک نئی صنف ہے اور اس کے موجد محسن بھوپالی ہیں۔ اس کے بعد جو دوسری بات تقریباً سب نے مانی ہے وہ یہ ہے کہ یہ صنف سخن ''نظمانہ'' مختصر نظم اور افسانے کی آمیزش سے بنی ہے۔

نظمانے کے بعد محسن بھوپالی کا جو شعری مجموعہ شائع ہوا وہ ''ماجرا'' تھا جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں اردو ادب کی دو اہم ترین اصناف میں ہی طبع آزمائی تھی یعنی اس میں صرف غزلیں اور نظمیں ہی تھیں۔ اس مجموعے کا فلیپ محسن بھوپالی کے مثالی شاعر فیض احمد فیض نے لکھا تھا۔ اور انھوں نے بھی محسن بھوپالی کی شاعری کا اعتراف کھلے دل سے کیا تھا۔ فیض احمد فیض محسن بھوپالی کی شاعری کے بارے میں

لکھتے ہیں۔

''محسن کا صحت مند، بامقصد، حقیقت پسندانہ اور انسان دوست مسلک فکر ہے جس کا بیان آپ نے ابتدائی الفاظ اور پہلی نظم ''دعا'' میں کیا ہے۔ پراگندہ خیالی اور کج مج نویسی کے موجودہ دور میں ایسی ہر تحریر مستحسن اور مغتنم ہے۔''[۱۱]

اس کے بعد ۱۹۸۸ء میں اگلا شعری مجموعہ گردمسافت شائع ہوا اس میں نظموں اور غزلوں کے علاوہ ہائیکو بھی تھے۔ اس کے بعد محسن بھوپالی کے دو ایسے شعری مجموعے شائع ہوئے جو صرف ہائیکو پر ہی مبنی تھے، جن کے نام ''منظر پتلی میں'' اور ''چیری سے چنبیلی تک'' ہیں۔ اس صنف سخن کے حوالے سے محسن بھوپالی کی ہائیکو نگاری پر ناقدین گفتگو کی ہے۔ محسن بھوپالی کی ہائیکو نگاری کے حوالے سے بیشتر ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ ہائیکو کی ابتدائی صورت تو محسن بھوپالی سے پہلے بھی اردو میں موجود تھی لیکن محسن بھوپالی نے ہائیکو کا موجودہ ہیئت کے تعین میں بہت بڑا کردار ادا کا ہے۔ اور یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہائیکو کی مندرجہ ذیل ہیئت طے ہوگئی ہے۔

فع۔لن۔فع۔لن۔فع = ۵

فع۔لن۔فع۔لن۔فع۔لن۔فع = ۷

فع۔لن۔فع۔لن۔فع = ۵

رفیق سندیلوی نے محسن بھوپالی کے ہائیکو پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''انھوں نے ہائیکو میں اپنی نگاہ احساسات کی طغیانی کی بجائے آہستہ خرام لہروں پر مرکوز کی ہے اور ہولے ہولے ان کے ساتھ تیر کر فطرت اور محبت کے عالم دیکھے ہیں۔ ان کے ہائیکو پڑھ کر محبت اور فطرت کی گوناگوں حقیقتوں اور رویوں سے آشنائی و آگہی حاصل ہوتی ہے۔ ان کے یہاں فطرت کا کوئی

مظہر اور محبت کا کوئی جذبہ جہاں جہاں بھی انضمام پذیر ہوا ہے،
ہائیکو ایک دلکش سطح پر اتر کر قاری کے محسوسات کو چھیڑنے میں
کامیاب رہا ہے۔'' ۱۲

مجموعی طور پر شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرنے والے ناقدین، اسلم فرخی، سلطان جمیل نسیم، سحر انصاری، ڈاکٹر تقی عابدی وغیرہ بہت سے ناقدین وادیب نے محسن بھوپالی کے فن، ادب اور شخصیت پر اظہار خیال کیا ہے۔ سب نے محسن بھوپالی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے، ان کی شاعری اور ان کے فن کا اعتراف کیا ہے۔ اور اردو شاعری میں ان کی نصف صدی سے زیادہ کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

مختلف اصناف سخن کے حوالے سے بحثیت مجموعی محسن بھوپالی کی شاعرانہ سربلندی اور شناخت۔

محسن بھوپالی اپنی شاعری کا آغاز نظموں سے کیا تھا پہلے بچوں کی نظمیں اور پھر بعد میں سنجیدہ ادبی نظمیں کہنے لگے۔ بچوں کی نظموں کا سلسلہ چونکہ بہت مختصر تھا اس لیے ان نظموں کا بچوں کے اردو ادب میں کیا مقام ہوگا کہنا مشکل ہے کیونکہ انھوں نے بہت کم نظمیں کہی تھیں۔ لیکن اردو میں بچوں کی نظموں کی جو کمی ہے اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر ان نظموں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بچوں کی نظمیں بھی ایسی نہیں ہیں کہ ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ بحر حال ان کی اہمیت ہے، اور کئی ایسی نظمیں ہیں جن میں بچوں کے لیے بہت اچھے پیغام بھی ہیں اور انھیں نصابی کتابوں میں بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک اردو نظم میں محسن بھوپالی کے مقام سوال ہے تو یہ ایک بحث طلب موضوع ہیں اور نظم کی پوری روایت کو سامنے رکھ کر ہی کوئی بات کہی جا سکتی ہے۔ ان کے پہلے مجموعے کی نظمیں نسبتاً کمزور تھیں ان میں خارجی اور براہ راست بیان زیادہ تھا ان پر مشاعروں کی مقبولیت کا اثر زیادہ تھا۔ لیکن ان کے دوسرے مجموعہ ''ماجرا'' میں فنی

اور تخلیقی سطح پر زیادہ کامیاب نظمیں نظر آتی ہیں۔ اور ان کا فن اپنے کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ ان نظموں میں فکری گہرائی زیادہ ہے، بیان میں جامعیت اور تہداری، استعاری سازی میں بھی وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ پہلے مزاحیہ نظمیں تھیں اب ان کی جگہ گہرے طنز نے لے لی ہے۔ یہ کیفیت ان کے بعد کے مجموعوں میں اور شدید ہوتی جاتی ہے۔ یہ صفات ان کی نظموں کی بنیادی صفات ہو جاتی ہیں۔ اس طرح محسن بھوپالی کا نام ترقی پسند نظم نگاروں میں ایک اہم نام بن کر ابھرتا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک میں نظم نگاروں کی کمی نہ تھی، نظم ان کی ترجیحات میں تھی اس لیے ترقی پسند نظم نگاروں میں اپنا ایک مقام بنالینا معمولی بات نہ تھی۔

غزل محسن بھوپالی کی ابتدائی شاعری سے ہی بہت اہم صنف تھی جو آخر تک ان کے ساتھ رہی۔ غزل ویسے بھی اردو کی سب سے مقبول صنف رہی ہے۔ غزل بڑی سخت جاں صنف شاعری ہے اس پر کئی بار برے وقت بھی آئے لیکن اس صنف نے ہر بار اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھال لیا۔ غزل اپنے آپ کو ہی نئے حالات کے مطابق نہیں ڈھالتی ہے بلکہ یہ شاعر کو بھی اپنے سانچے میں ڈھال لیتی اور کسی بھی شاعر کو اپنی منفرد شناخت جلدی نہیں بنانے دیتی ہے۔ محسن بھوپالی کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی جو خوبیاں ہیں ان کو اپنے وقت اور سیاسی حالات کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا کہ دونوں ایک جسم اور دو جان ہو گئے۔ اور اس طرح محسن بھوپالی جو بات کہتے ہیں وہ سیدھے دل میں اتر جاتی ہیں۔ اس لیے ان کے بہت سے اشعار ضرب المثل بن چکے ہیں۔ اس تعلق سے ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں۔

> ''محسن بھوپالی وہ واحد شاعرِ دوراں ہیں جن کے کئی اشعار لوگوں کا تکیۂ کلام بن چکے ہیں، حضرات! اس کی گواہی میں خود دے سکتا ہوں کہ میں جناب محسن بھوپالی سے آشنا ہونے سے پہلے موصوف کے اشعار سے مانوس تھا اور ہمیشہ فکری یادداشت میں محفوظ کیے ہوئے تھا۔''[۱۳]

اردو غزل میں محسن بھوپالی کی یہی انفرادیت ہے کہ ان کے بہت سے شعر ضرب المثل بن چکے ہیں لوگ سیاسی، سماجی موضوعات پر بات کرتے ہوئے بار باران کے شعر پڑھتے ہیں یہی محسن بھوپالی کی کامیابی ہے۔

محسن بھوپالی کی تیسری اور ایک بہت اہم صنف سخن قطعہ نگاری ہے۔ان کا دوسرا مکمل مجموعہ ''جستہ جستہ'' صرف قطعات پر مبنی ہے۔اس کے علاوہ بھی ان کے کئی مجموعوں میں قطعات شامل ہیں۔ان کے قطعات کے بارے میں احمد ندیم قاسمی نے جو بات لکھی تھی اسی کو حتمی فیصلہ سمجھا جا سکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

> ''محسن نے نہ صرف قطعے کے گذشتہ پینتیس چالیس برس کی روایت سے استفادہ کیا ہے بلکہ اس نے قطعے کے کینوس کو مزید وسعت بھی دی ہے۔اس نے اپنے قطعات میں سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل کو موضوع بنایا ہے اور اسے محض حسن و عشق کے مسائل سے محدود نہیں رکھا۔ پھر قطعے کو قاری کے دل میں اتارنے کے لیے اس کے پاس ایک نہایت موثر ہتھیار موجود ہے اور یہ اس کا طنزیہ لہجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بیشتر قطعات کے آخری مصرعوں کا نکیلا طنز قاری کے ذہن میں پیوست ہو جاتا ہے۔''[۱۴]

محسن بھوپالی کی چوتھی اہم صنف سخن ان کے نظمانے ہیں۔ یہ صنف سخن خود محسن بھوپالی کی ایجاد کرتا ہے۔اس صنف میں کے بارے میں سحر انصاری لکھتے ہیں۔

> ''انگریزی میں بھی دو الفاظ کے بعض اجزا کو ملا کر ایک نیا لفظ بنا لیا جاتا ہے۔ جیسے FICTION اور CRITICISM کو ملا کر CRICTION بنایا گیا ہے۔ اس لیے نظم اور افسانے کے امتزاج سے ''نظمانہ'' کا لفظ اس نئی صنفِ شعر کے لیے مناسب رہے گا اور اس میں شک نہیں کہ نظمانہ اب اس مخصوص مختصر منظوم

افسانے کے لیے مختص ہو کر رہ گیا ہے جسے محسن بھوپالی نے ایک ہی صنف کے طور پر متعارف کرایا ہے۔''۱۵؎

اس تعریف سے ظاہر ہے کہ نظمانہ نظم اور افسانے کو ملا کر ایک صنف بنائی گئی ہے۔ محسن بھوپالی ہی اس کے موجد ہیں کسی حد تک خاتم بھی کیونکہ اس صنف میں کسی اور نے اس طرح سے توجہ نہیں کی۔ لیکن محسن بھوپالی کے نظمانوں کو تقریباً تمام اہم ناقدین نے پسند کیا ہے۔ خاص طور سے ان نظموں کے اختصار میں افسانوی رنگ پیدا کر دینا بہت بڑی کامیابی مانی گئی ساتھ ہی ان نظمانوں میں جو طنز ہے وہ بھی اس شاعری کو بہت اہم شاعری بناتا ہے۔ اختصار کا یہ عالم ہے کہ پورے مجموعے میں کوئی بھی نظمانہ گیارہ مصرعوں سے زیادہ طویل نہیں ہے لیکن محسن بھوپالی نے اس میں نشتریت بھر دی ہے اور اس کا وار اس قدر شدید ہوتا ہے کہ سننے اور پڑھنے والے کے دل پر سیدھے اثر ہوتا ہے۔

محسن بھوپالی کی پانچویں اہم صنف سخن ہائیکو ہے۔ جس میں انھوں نے نہایت سنجیدگی سے شاعری کی ہے۔ ہائیکو کو جاپانی شاعری میں وہی مقام حاصل ہے جو اردو میں غزل کو حاصل ہے۔ اردو میں محسن بھوپالی سے قبل ہائیکو کے کچھ تجربے تو ملتے ہیں۔ لیکن ہائیکو کی موجودہ ہیئت اور اس کو شناخت دینے میں سب سے اہم اور مرکزی کردار محسن بھوپالی نے ہی ادا کیا ہے۔

محسن بھوپالی کے ہائیکو دوسرے ہائیکو نگار شاعروں سے کافی حد تک مختلف ہیں۔ یہی نہیں یہ ہائیکو خود ان کی دوسری اصناف کی شاعری سے بھی بہت مختلف ہیں۔ اس کی سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ ہائیکو فطرت کے مناظر، موسم کی رنگا رنگی اور ان کے بہت ذاتی احساسات پر مبنی ہیں۔ ان میں سیاسی، سماجی اور اخلاقی موضوعات کی گزر بہت کم ہے جو ان کی دوسری اصناف کی بہت اہم صفات ہیں۔ ان ہائیکو میں فکر بہت مدھم ہے اور فن اپنے عروج پر ہے۔ ہائیکو میں ان کا جمالیاتی ذوق پوری طرح سے ابھر کر سامنے آیا ہے۔

محسن بھوپالی کو ہائیکو کی صنف میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے، ناقدین کا خیال ہے کہ ہائیکو کے مزاج کو سمجھ کر اور اسے اصل جاپانی ہائیکو کے متوازی قائم کرنے میں محسن بھوپالی کا مرکزی کردار رہا ہے۔ ان کا یہ کردار جہاں ایک طرف ہائیکو کی ہیئت اور مزاج کے تعین میں رہا ہے۔ وہیں انھوں نے ہائیکو کے مثالی نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ اور اس صنف کو وہاں پہنچا دیا ہے کہ ان کے ہائیکو جاپانی ہائیکو کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ محسن بھوپالی نے ہائیکو کی صنف میں بہت دل لگا کر کام کیا ہے۔ اور کسی حد تک اپنی شعری شخصیت کو تبدیل کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی ہے۔ کیونکہ ان کی کسی دوسری صنف میں اس طرح سے ان کے ذاتی تجربے شامل نہیں ہو سکے تھے۔ محسن بھوپالی دوسری اصناف میں بیشتر سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کو ہی شاعری میں پروتے رہیں ہیں۔

اردو ہائیکو کی تاریخ میں محسن بھوپالی کا نام ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اول ہائیکو کی ہیئت اور مزاج کے تعین میں ان کا بہت اہم رول رہا ہے، دوم انھوں نے بہت اچھے اور کسی حد تک مثالی ہائیکو لکھے ہیں، جس سے دوسرے ہائیکو نگار شاعروں کے لیے وہ نمونے کا کام کرتے ہیں۔ تیسرے جاپانی ہائیکو پر انھوں نے بھرپور تحقیقی وتنقیدی کام کیا ہے اور اردو میں جاپانی ہائیکو کا تعارف کرانے کے لیے بھی انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے بے شمار جاپانی اور سندھی ہائیکو کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے یہ ترجمے بہت بڑی تعداد میں ہیں پوری جاپانی ہائیکو کی تاریخ وتہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ محسن بھوپالی نے جاپانی ہائیکو کا بہت گہرا اور وسیع مطالعہ کیا ہے۔ اور ہائیکو کے بارے میں جو مضامین لکھے ہیں وہ استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔

اردو شعر وادب میں محسن بھوپالی کا مقام ومرتبہ۔

اردو ادب خاص طور سے اردو شاعری میں محسن بھوپالی کے مقام پر غور وفکر کرنے پر ان کے چند امتیازات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان میں سب پہلی بات جو

متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں پاکستان بننے سے لے کر اکیسویں صدی کے ابتدائی چند برسوں تک کی پوری تاریخ رقم ہے۔ لیکن یہ تاریخ سیاسی اور سماجی تاریخ ہی نہیں ہے اس میں لوگوں کے مزاج اور رویے بھی نظر آتے ہیں اور پاکستانی قوم کے اور عوام کے تمام مسائل وجد جہد بھی ہیں۔ محسن بھوپالی کی شاعری میں وقت سانسیں لیتا اور دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری پر ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے مضمون محسن...... شخص وفن میں لکھا ہے۔

> ''جس زمانے میں ''شکستِ شب'' شائع ہوئی ہے وہ واقعی احساس شکستِ شب کا دور تھا۔ یہ احساس عام تھا کہ رات کی تاریکی چھٹ گئی ہے اندھیرا دور ہو رہا ہے روشنی پھوٹ رہی ہے، جس صبح نو کا خواب دیکھا گیا وہ آہستہ آہستہ طلوع ہو رہی ہے۔ مگر محسن کے جدید ترین شعری مجموعے ''گردِ مسافت'' پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے تو سب کچھ کھو دیا صرف گرد سفر ہمارا مقدر ہے۔ محسن کے اس شعری سفر سے جس کا نقطۂ آغاز شکستِ شب فی الحال نقطۂ اختتام مسافت ہے۔ مجھے اپنی قومی ملکی اور سیاسی تاریخ کا احساس ہوتا ہے شریک سفر نہ ہونے والوں کی منزل رسی اس کا احساس محسن ہی کو نہیں ہم سب کو ہے مگر محسن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس صداقت کو بھرپور انداز میں بیان کر دیا ہے۔ ہم مصلحتوں کے شکار ہیں، بڑبڑاتے اور جلتے تو رہتے ہیں مگر کھل کر اظہار نہیں کرتے۔''[۱۶]

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ محسن بھوپالی کی شاعری، قوم کی تقریباً ساٹھ سالہ زندگی کو آئینہ دکھاتی ہے۔ اور یہ بات کوئی معمولی نہیں ہے کہ کسی شاعر کا کلام اس قوم اور معاشرے کی زندگی، اس کے اخلاقی زوال، سماجی پستی اور سیاسی مکر و فریب کا آئینہ بن جائے۔ محسن بھوپالی کی شاعری یہ کام بڑے خوبصورت انداز اور شعری روایت کی

پاسداری کرتے ہوئے کرتی ہے۔ یہ مقام شاعری کے ذریعے بہت کم شاعروں کو حاصل ہوتا ہے۔

محسن بھوپالی کی شاعری کی دوسری سب سے بڑی دین یہ ہے کہ وہ اردو میں غزل اور نظم کی مستحکم روایت میں بھی اپنی ایک الگ شناخت بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ چند نادر فکر و خیالات سے واقف کراتے ہیں۔ ان کے اشعار میں وہ قوت ہے کہ اس کا لوگوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اور لوگوں کو وہ یاد رہ جاتے ہیں۔ یہی نہیں وہ ان اشعار کا اپنی سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی میں بات بات پر ذکر کرتے ہیں۔ چاہے وہ حکومت کے ایوانوں کی تقریریں ہوں، یا کالج کے بحث و مباحثے ہوں یا تہذیبی اور ذاتی گفتگو ہو۔ سیاسی اور عشقیہ موضوعات پر مبنی ان کے دو اشعار ملاحظہ ہوں یہ دونوں شعر ضرب الامثال بن چکے ہیں۔

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

چاہت میں کیا دنیا داری عشق میں کیسی مجبوری
لوگوں کا کیا سمجھانے دو ان کی اپنی مجبوری

اردو شاعری میں محسن بھوپالی کا امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اس کی تین اصناف پر غیر معمولی اثر ڈالتے ہیں۔ قطعہ نگاری میں وہ اردو کے سب سے بڑے شاعروں میں نظر آتے ہیں۔ اس میں کچھ نئے رنگ و آہنگ بھرتے ہیں۔ ان کے قطعات کی ہیئت بہت موثر ہے۔ وہ پہلے مصرے میں موضوع کا تعارف کراتے ہیں، دوسرے مصرے میں تجسس پیدا کرتے ہیں تیسرے مصرعے میں بات کو کلائمکس پر پہنچاتے ہیں اور چوتھے مصرعے میں ایسا بھرپور وار کرتے ہیں کہ وہ سیدھا دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ چوتھے مصرعے میں اکثر طنز کا وار بہت شدید ہوتا ہے۔ لگتا ہے سارا قطعہ اسی بات کہنے کے لیے ماحول تیار کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

نظمانہ ایک نئی صنف سخن ہے جس کے موجد بھی محسن بھوپالی ہیں اس کے سب سے بڑے شاعر بھی۔ محسن بھوپالی نے اسے ایک بہت موثر صنف سخن کے طور پر اردو میں قائم کیا ہے۔ یہ صنف نظم میں افسانوی خصوصیت کو پیدا کرنے کا ایک بہترین تجربہ ہے۔ سارے نظمانے بہت مختصر ہیں لیکن اتنے ہی موثر بھی ہیں۔ بیشتر نظمانوں میں دو مختلف کیفیات ہیں۔ لیکن دونوں کے درمیان ایک متضادی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ یہ تکنیک ان نظمانوں میں بہت موثر ثابت ہوئی ہے۔ اور اس سے طنز کا ایک عجیب احساس ہوتا ہے جو براہ راست نہیں ہے بلکہ غور وفکر کے بعد سمجھ میں آتا ہے شاعری میں اس بات کو کمال سمجھا جاتا ہے۔ نظمانہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں ابھی بھی بڑے امکانات ہیں جنھیں شاعری میں بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

محسن بھوپالی ہائیکو کے پہلے شاعر نہ سہی لیکن ہائیکو کی ہیئت اور اس کے مزاج کو طے کرنے والے شاعر محسن بھوپالی ہی ہیں۔ اردو میں اس شاعری کو رواج دینے میں بھی محسن بھوپالی کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ ساتھ ہی اگر ایمانداری سے اس صنف کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو وہ اس صنف کے سب سے بڑے شاعر بھی ہیں۔ اردو میں ہائیکو کی ایک پوری روایت بن چکی ہے اور اس صنف میں اب بہت سے شاعر طبع آزمائی کررہے ہیں، لیکن اس صنف میں محسن بھوپالی کی حیثیت بہت ممتاز ہے۔

محسن بھوپالی کی شاعری کی ایک امتیازی خصوصیت ان کا طنزیہ لہجہ ہے۔ اردو میں نثر میں طنز ومزاح کی بہت مستحکم روایت ہے لیکن شاعری میں طنز بہت کم شاعر صحیح سے برت سکے ہیں۔ اس روایت میں سب سے بڑا نام اکبر الہ آبادی کا ہے۔ اس کے بعد بہت سے شاعروں نے اپنی شاعری میں طنزیہ عناصر کو شامل کیا۔ لیکن محسن بھوپالی نے طنز کے ایک منفرد آہنگ کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ ان کے طنز کے بارے میں محمد امین لکھتے ہیں۔

”محسن کے ان قطعات اور اس قسم کی نظموں اور غزل کے بعض اشعار میں اسلوب و بیان اور شعری محاسن کے ساتھ ساتھ سب

سے زیادہ اثر کرنے والی چیز محسن کا اندازِ طنز اور تنقید ہے۔ محسن کا
طنز بہت تیکھا، تیز اور متاثر کن ہوتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ ان
کے طنز میں تلخی یا زہر ناکی نہیں ہوتی۔ ان کا طنز احساس کو بیدار
کرنے کا ایک حربہ ہے۔ وہ طنز سے کسی کو زخمی یا ہلاک کرنے کا
کام نہیں لیتے۔'' ۱۷

نثر میں بھی محسن بھوپالی نے ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اور اس میں بھی
کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ سفر نامہ، تنقید، اخبار میں کالم نگاری اور بڑی
شخصیات کے انٹرویوان کے اہم نثری کارنامے ہیں۔ نثر میں محسن بھوپالی کی کئی کتابیں
بھی ہیں۔ ان کی اہمیت صرف اس لیے نہیں ہے کہ وہ ایک اہم شاعر محسن بھوپالی کی
نثری تحریریں ہیں، بلکہ ان کی اپنی ایک الگ شناخت ہے۔

جس شخص کے اتنے کام ہوں وہ شخص یقیناً اردو شعر و ادب کی تاریخ میں اپنا
ایک اہم مقام رکھتا ہے اور اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ کبھی غزل گو کے طور پر، کبھی نظم
نگار کی حیثیت سے کبھی، قطعہ نگار کی حیثیت سے، کبھی نظمانہ کے موجد کی حیثیت سے
اور کبھی ہائیکو نگار کی حیثیت سے بھی۔

حوالہ جات:

۱۔ محسن بھوپالی، انٹرویو، جنگ کے نمائندے سرور ساجد، ۲۳، دسمبر ۱۹۹۴

۲۔ جمال نقوی، محسن کی شخصیت اور فن کے رنگ، انشاء، حیدرآباد، اپریل تا دسمبر
۲۰۰۷ء ص ۶۰

۳۔ نیاز فتح پوری، نگار، پاکستان، بحوالہ جستہ جستہ رگرد مسافت، ایوان ادب، ناظم آباد،
کراچی، ۱۹۸۸

۴۔ ممتاز حسین، شکست شب کا فلیپ، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، دسمبر ۱۹۸۹

۵۔ احسان دانش، نیا پیام، لاہور، ۱۵ ستمبر ۱۹۶۳ء

۶۔ احمد ندیم قاسمی، تاثرات، جستہ جستہ/ گرد مسافت، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۸ء

۷۔ کہکشاں، جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ء کراچی ص ۱۲۴

۸۔ ماہنامہ سپوتنک، اکتوبر ۲۰۰۰، لاہور، ص ۱۴۰ و ۱۴۱

۹۔ ماہنامہ سپوتنک، اکتوبر ۲۰۰۰، لاہور، ص ۱۳۹

۱۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی، روشنی تو دیے کے اندر ہے، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۷۰

۱۱۔ ماہنامہ سپوتنک، اکتوبر ۲۰۰۰، لاہور، ص ۱۳۸

۱۲۔ رفیق سندیلوی، اردو کے ہائیکو نگار شعراء، ہائیکو انٹرنیشنل، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۹ء، ص ۶۶، ۶۷

۱۳۔ کہکشاں، جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ء کراچی ص ۸۸

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، تاثرات، جستہ جستہ/ گرد مسافت، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۸ء

۱۵۔ سحر انصاری، نظمانے کا دیباچہ، عوامی دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۵ء، ص ۱۳

۱۶۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، محسن...... شخص و فن، ماہنامہ سپوتنک، اکتوبر ۲۰۰۰، لاہور، ص ۱۲۰

۱۷۔ سحر انصاری، محسن کی نظمانہ نگاری، عوامی دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۵ء، ص ۱۲

کتابیات:

بنیادی ماخذ:

شعری مجموعے:

۱۔ شکستِ شب (نظموں، غزلوں اور قطعات پر مبنی) دسمبر 1989ء، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی۔

۲۔ جستہ جستہ (قطعات کا مجموعہ)، 1988ء ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی،

۳۔ نظمانے (محسن بھوپالی کی ایجاد کردہ صنف سخن) 1975ء، عوامی دارالاشاعت، کراچی،

۴۔ ماجرا (نظموں اور غزلوں پر مبنی) دسمبر 1981ء، ناظم آباد، کراچی۔

۵۔ گردِ مسافت (نظموں، غزلوں اور ہائیکو پر مبنی) دسمبر 1988ء، ناظم آباد، کراچی،

۶۔ مجموعۂ سخن (اب تک کے تمام مجموعوں کا کلیات) دسمبر 1992ء، ناظم آباد، کراچی،

۷۔ موضوعاتی نظمیں (اہم واقعات کے ردعمل میں لکھی گئیں) دسمبر 1993ء، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی۔

۸۔ روشنی تو دیے کے اندر ہے، ستمبر 1996ء ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی۔

۹۔ شہر آشوب کراچی (گلنار آفرین کے ساتھ نظموں کا مشترکہ مجموعہ) 1997ء، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی۔

۱۰۔ منزل (غزلوں، نظموں اور نظمانوں پر مبنی) ستمبر 2003ء، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی۔

۱۱۔ چیری سے چنبیلی تک (ہائیکو) 2005ء، کینوس کیمونکیشن، کامرشیل اسٹریٹ فیز، کراچی

۱۲۔ محسن بھوپالی کے سو شعر، 2005ء کینوس کیمونکیشن، کامرشیل اسٹریٹ فیز، کراچی۔

انتخاب و منظوم ترجمہ:

۱۔ جاپان کے چار عظیم شاعر ۱۹۹۷ء
۲۔ ریگزار کے پھول (سندھی سے منظوم ترجمہ) ۲۰۰۶ء

نثر:

۱۔ قومی یکجہتی میں ادب کا کردار 1985ء، مکتبہ فکر ونظر، ناظم آباد، کراچی۔ (ادب کی بڑی شخصیات سے قومی یکجہتی پر مصاحبے)
۲۔ حیرتوں کی سرزمین (امریکا و کناڈا کا سفرنامہ) 1992ء، مشہور پریس، کراچی۔
۳۔ نقدِ سخن (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، 1998ء

ثانوی ماخذ:

کتابیں:

۱۔ ڈاکٹر محمد نعمان، بھوپال ادب کے آئینے میں، 1994ء سیفیہ کالج، بھوپال،
۲۔ پروفیسر آفاق احمد، (مرتبہ) مدھیہ پردیش میں اردو زبان و ادب، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال، 1996ء
۳۔ ڈاکٹر ظہیر رحمتی، غزل کی تنقیدی اصطلاحات، 160، اترا کنڈ، جے این یو، نئی دہلی، 2005ء
۴۔ نزہت انیس، 'محسن بھوپالی شخصیت و فن'، فرید پبلشرز اینڈ بک سیلز، اردو بازار، کراچی، 2002ء

English Book:

1. Shaharyar M Khan, The Begums of Bhopal- A Dynasty of women Rulers in Raj India, I. B. Tauris Publishers, London WC1B4DZ, 2000, page 230

اخبار و رسائل:

۱۔ ہائیکو انٹرنیشنل، Counsul General of Japan in Karachi. فروری 1999ء

۲۔ نیوز جدہ، 21 جون، 1995ء

۳۔ ماہنامہ، اسپوتنک، لاہور، اکتوبر 2000ء

۴۔ ماہنامہ چہارسو اکتوبر، 1992ء

۵۔ روزنامہ جنگ، کراچی، ۳ مئی 1951ء

۶۔ پندرہ روزہ نمکدان، کراچی ۲۳ مارچ تا ۱۲ اپریل، 1954ء

۷۔ ماہنامہ بچپن، جون 1949ء

۸۔ سہ ماہی انشاء، حیدرآباد، اپریل تا دسمبر 2007ء

۹۔ ماہنامہ اسپوتنک، لاہور، اکتوبر 2000ء

۱۰۔ سہ ماہی، کہکشاں، جنوری تا مارچ، 2004ء

۱۱۔ روزنامہ نوائے وقت، 19 نومبر 1992ء

۱۲۔ روزنامہ، جنگ، 23 دسمبر 1994ء، کراچی

۱۳۔ ماہنامہ بیاض، محسن...... شخص و فن، مئی 2001، لاہور

۱۴۔ روزنامہ جنگ، 23 ستمبر 1994ء

۱۵۔ ماہنامہ افکار، کراچی، ستمبر 1985ء

۱۶۔ نیا پیام، لاہور، 15 ر 1963ء

☆☆☆
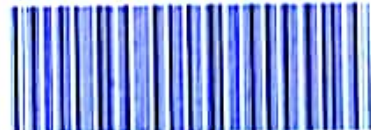
MOHSIN BHOPALI - Ek MUTALA'AH
by: Arshi Sultan
EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA
ISBN 978-93-88736-72-5
978-93-88736-72-5
www.ephbooks.com